شجر ہائے سایہ دار

سیدہ حمیرا مودودی

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

انسانوں سے بھری پری اس دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں، جو مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ وہ اپنی مہلتِ عمر پوری کر کے اِس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن ان کی خدمات اور کارناموں کی وجہ سے ان کے وجود کو محسوس کیا جاتا ہے۔ وہ اُن درختوں کے مانند ہوتے ہیں، جن کا سایہ دور تک اور دیر تک باقی رہتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (۱۹۰۳-۱۹۷۹) کی بڑی بیٹی محترمہ سیّدہ حمیرا مودودی کی ایک دل کش و دل پزیر تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے بیسویں صدی عیسوی کے دو ''شجر ہاے سایہ دار'' کی خانگی روداد شب و روز پیش کی ہے۔ اِس میں پہلا شجر تو خود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ہیں جو نہ صرف اپنے اہل و عیال اور احباب و متعلقین کے لیے بلکہ اپنوں اور پرایوں سب کے لیے سایہ دار درخت تھے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ ان کی نظر میں اپنے یا پرایے کا فرق تھا ہی نہیں۔ وہ تمام انسانوں کو ایک برادری کے طور پر دیکھتے تھے اور شب و روز ان کی دنیوی و اخروی فلاح و نجات کے لیے فکرمند رہتے تھے۔ تحریک اسلامی کا قیام ان کی اِسی فکرمندی کا مظہر ہے۔ دوسرا شجر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ محترمہ محمودہ بیگم رحمہا اللہ (م: ۲۰۰۳) ہیں، جو کہ مصنفہ کی والدہ محترمہ بھی ہیں۔ یہ وہ مثالی خاتون ہیں، جنھوں نے خاموشی کے ساتھ اپنے اخلاق و کردار، ایثار و قربانی اور تربیت و تعلیم سے پوری تحریک کو متاثر کیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا مودودیؒ کی دینی و تحریکی اور تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں میں ان کی اہلیہ کس حد تک شریک و ہم رکاب رہی ہیں اور امت مسلمہ پر انھوں نے کیا کیا احسانات کیے ہیں۔

محترمہ سیدہ حمیرا مودودی، مولانا مودودیؒ کی بڑی صاحب زادی ہیں۔ وہ انگریزی میں پوسٹ گریجویٹ ہیں، جدّہ، سعودی عربیہ کے ایک کالج میں انگریزی ادبیات کی معلّمہ رہی ہیں۔ لیکن ذاتی دل چسپی سے انھوں نے عربی اور اسلامیات میں بھی غیر معمولی صلاحیت بہم پہنچالی ہے۔ اب وعظ وتبلیغ اور درس وتقریر ہی ان کا وظیفہ حیات ہے۔ یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب مولانا مودودی کی حیات وخدمات کو سمجھنے میں غیر معمولی ممد ومعاون ثابت ہوگی۔

امید ہے کہ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز کی اس پیش کش کو قدر و پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ناشر

گزارشیں

۲۰۰۳ء کا سال مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے حوالے سے ایک یادگار سال تھا۔ ان کے صد سالہ 'سالِ ولادت کو حوالہ بناتے ہوئے' اس سال کے دوران نہ صرف پاکستان میں' بلکہ بیرونِ ملک بھی' مختلف علمی اداروں نے مذاکروں اور سیمی ناروں کے ذریعے ان کی یاد تازہ کی گئی۔ اس کے ساتھ مضامین ومقالات اور مطبوعات کے ذریعے بھی اس بطلِ جلیل کی علمی و دینی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ یہ اعتراف اور یہ تذکرہ' مرحوم کی غیرتِ ایمانی' جرأتِ مجاہدانہ اور بصیرتِ علمی کا مظہر ہے۔ سید مودودیؒ اُن 'مردانِ راہ' میں سے تھے' جن کے بارے میں اقبال کہہ گئے ہیں:

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لیے

ماہ نامہ ترجمان القرآن' لاہور کی دو خصوصی اشاعتیں (حصہ اول اکتوبر ۲۰۰۳ء۔ حصہ دوم: اپریل ۲۰۰۴ء) اسی تذکرے کا ایک حصہ تھیں۔ اِن اشاعتوں میں شامل تحریروں میں قوسِ قزح کے رنگ تھے' پاکیزہ جذبوں کی آنچ تھی اور رہوارِ قلم کو روک روک کر چلنے کا قرینہ تھا۔ انھی میں سید محترم کی صاحبزادی حمیرا مودودی صاحبہ [پ: ۲۲ جولائی ۱۹۴۰ء' دہلی] کا مضمون 'شجر ہائے سایہ دار' سامنے آیا۔ واقعہ یہ ہے کہ صبر سے گُندھے' آنسوؤں سے لکھے اور خوشبو کے پیکر میں ڈھلے اس نثر پارے میں ایک عبدِ رحمٰن اور عاشقِ رسولؐ کی قابلِ قدر زندگی کا عکس تھا ع

ارمغانِ آخرت ہے لذتِ عشقِ رسولؐ

ترجمان کا دامن ایک مختصر مضمون کی گنجایش ہی نکال سکتا تھا' لیکن طلب کی شدت کا

تقاضا تھا کہ اس گلدستے میں مزید پھول شامل کیے جائیں۔ مسلسل تقاضوں کے جواب میں، یادوں کے چمن سے جو پھول اُگتے اور کھلتے گئے، انھیں یکجا کیا تو اس مضمون کا کینوس پانچ گنا تک بڑھ گیا، جسے اب کتابی صورت میں پیش کیا جارہا ہے۔

بلاشبہ یہ کتاب سید مودودی علیہ الرحمہ اور ان کے محترم اہلِ خانہ کی زندگی کے ان گوشوں کا ایک عکس ہے، جن سے بیرونِ خانہ کے لوگ ناواقف تھے اور جنھیں پڑھ کر قارئین اپنی زندگیاں اللہ کی راہ میں کھپانے کا حوصلہ پائیں گے۔ ان شاءاللہ۔

متعدد قسطوں میں لکھے گئے اس غیر روایتی اور منفرد مضمون کی تدوین کے بعد، اسے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے بھی ایک نظر دیکھا اور نوک پلک درست کیے۔

اللہ تعالیٰ اس صدقۂ جاریہ کو قبول فرمائے۔ سید مودودیؒ نے زندگی کا ایک ایک لمحہ، اپنے سارے رشتے اور اپنے پورے جذبات، جس مقصدِ حیات کی نذر کر دیے، اللہ تعالیٰ اس شمع کو فروزاں رکھے اور اسے، ان کے تشکیل دیے ہوئے قافلے کو راست روی پر گامزن رہنے کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

سلیم منصور خالد

احوالِ واقعی

ابا جان سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ملت اسلامیہ کا سرمایہ تھے۔ ان کی یادیں بھی ملت کی امانت ہیں۔ اسی سلسلے میں میں نے کچھ یادداشتیں ترجمان القرآن کے خصوصی شمارے (مئی ۲۰۰۴ء) میں اشاعت کے لیے پیش کی تھیں۔

دوسروں کو صبر کی تلقین کرنا بہت آسان ہے' لیکن خود صبر کرنا بہت مشکل۔ صبر سب سے کڑوا گھونٹ ہے اور میں نے اپنی دادی اماں اور اپنے والدین کو ساری زندگی یہ تلخ گھونٹ قطرہ قطرہ پیتے اور کمال صبر کا مظاہرہ کرتے دیکھا ہے۔ اس طرح یہ داستان صبر کے گھونٹوں کی داستان ہے۔ آنکھ میں ہے وہ قطرہ جو گہر نہ بن سکا' لیکن یہ آنسو آنکھوں ہی میں رہے' کبھی پلکوں سے ٹپکنے نہ پائے۔ انھیں کبھی ٹپکنے کی اجازت نہیں دی گئی! کیونکہ دادی اماں نے کہہ دیا تھا:

''روتے کے ساتھ کوئی روتا نہیں ہے' جب کہ ہنستوں کے ساتھ سب ہنستے ہیں۔
رونے والوں کا تو دنیا تماشا دیکھتی ہے''

آج بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی صدی تھی' جنھوں نے اپنی تصانیف سے افکار کی دنیا میں انقلاب برپا کیا اور عالمِ اسلام کی بیش تر دینی تحریکوں نے ان کی برپا کی ہوئی تحریک سے غذا حاصل کی۔ لیکن یاد رکھیے کہ کسی مصنف کی عظیم تخلیقات تبھی وجود میں آتی ہیں' جب اس کے قریب ترین لوگ اسے ذہنی سکون اور آسودگی فراہم کریں۔

یہ محض یادیں نہیں ہیں' بلکہ ایک بطلِ جلیل (جن کو سید قطب شہیدؒ نے اپنی معرکہ آرا تفسیر فی ظلال القرآن میں 'المسلم العظیم' کے نام سے یاد کیا ہے) اور ایک عظیم سپوت کے عظیم

والدین اوران کی عظیم شریکِ حیات کے صبر وثبات کی داستانِ عزیمت ہے۔ آج کی عظیم اسلامی تحریک ایک ایسے گھر سے شروع ہوئی، جس میں چھوٹے چھوٹے نو بچے تھے' والدہ تھیں اور انتہائی کمزور صحت والی دمے کی مریض شریکِ حیات تھیں۔ اگر اس گھر کے مکین ایک لمحے کے لیے بھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے' یا کسی طرح کی بے احتیاطی کر جاتے تو یہ سب کچھ ایسا نہ ہوتا، جیسا کہ آج نظر آ رہا ہے۔ تحریک' عمل اور قیادت کا تعلق بہر حال انسانوں اور ان کے رویوں سے ہوتا ہے۔ کوئی محاذ کی پہلی صف میں اور کوئی پچھلی صف میں ہوتا ہے اور بعض بظاہر محاذ پر نہیں بھی نظر آتے' مگر معرکے میں ان کا ایک رول ہوتا ہے۔ اس لیے یہ داستان دراصل تمام عمر کی قربانی' بے نفسی اور خودداری کی داستان ہے۔ پردہ سرکا کر 'اس گھر' کی ایک جھلک جو اس کتاب میں دکھائی گئی ہے' اس سے قارئین کو کچھ تھوڑا سا اندازہ ہو پائے گا کہ

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

رسالے کے محدود صفحات کی بنا پر 'شجر ہائے سایہ دار' (دادی اماں' ابا جان اور والدہ صاحبہ) کے بارے میں کچھ زیادہ نہ لکھا جا سکا تھا--- چنانچہ اب انھیں نظر ثانی اور بعض اضافوں کے ساتھ قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔ ان اوراق کا مطالعہ کرتے ہوئے امید ہے قارئین محسوس کریں گے کہ ان کے سامنے ان عظیم ہستیوں کی تصویر واضح اور روشن ہوتی جا رہی ہے۔

حمیرا مودودی

ابّا جانؒ

اللہ تعالیٰ جب کسی شخص سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے تو اس کے لیے ابتدا ہی میں ایسے اسباب فراہم کر دیتا ہے کہ وہ اوائل عمر ہی سے اپنی منزل کا تعین کر کے یکسوئی کے ساتھ اس کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ ابا جان (سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ) اہلِ بیت سے منسوب ایک خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس نے پہلے ہرات کی طرف اور پھر اپنے جد امجد قطب الدین مودود چشتیؒ [۱۰۳۹ء- ۱۱۳۳ء] کے زمانے میں ہندستان کی طرف ہجرت کی۔ سید قطب الدینؒ سلسلۂ چشتیہ کے سب سے بڑے بزرگ تھے۔ یہ سلسلہ قرآن وسنت کی پابندی کا خصوصی التزام کرتا ہے۔ ہمارے دادا ابا [سید احمد حسنؒ: ۱۸۵۵ء-۱۹۲۰ء] نے وکالت کا پیشہ تو اختیار کیا تھا، لیکن اکثر ایسا ہوتا کہ عبادت و زہد کا میلان ان پر غالب آ جاتا، جس کے باعث وہ پیشہ وکالت کو بہت زیادہ وقت نہ دے پاتے اور پھر جس مقدمے کو حق وانصاف کے مطابق پاتے، صرف اسی کی پیروی کرتے تھے۔

زاہدانہ زندگی کے اسی دور میں حیدر آباد دکن (اب مہاراشٹر) کے شہر اورنگ آباد میں ۲۵ ستمبر ۱۹۰۳ء میں ابا جان کی ولادت ہوئی اور پرورش ہوئی۔ ان کی شخصیت پر ان کے والد گرامی کی تربیت کا بڑا گہرا اثر تھا۔ وہ اپنے کم سن بچے کو اپنے ساتھ مسجد لے جاتے تھے۔ اپنے ہم عصر علما و فضلا کی مجالس میں بٹھاتے تھے۔ قرآن کریم کی سورتیں یاد کراتے۔ عربی اور فصیح اُردو بولنے کی تعلیم ان کو دادا ابا ہی نے دی تھی۔

دادا ابا، ہمارے ابا جان کو راتوں میں انبیا علیہم السلام کے واقعات، بزرگان دین کے

حالات اور اسلامی تاریخ کی کہانیاں سناتے۔ مختلف دلچسپ پیرایوں میں اسلامی عقائد ذہن نشیں کراتے تھے اور ان پر دینی رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ عام نشست و برخاست میں بھی انھیں اخلاق وتہذیب کی اصلاح کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ اردو زبان کی صحت کی طرف بھی ان کی خاص توجہ تھی۔ ابا جان کہا کرتے تھے: ابا جان اگر مجھ میں کوئی خراب عادت دیکھتے تو وہ مجھ سے چھڑا دیا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے اپنے نوکر کے بچے کو مارا تو انھوں نے اسے بلایا اور کہا: 'جیسے اس نے تمھیں مارا ہے تم بھی اسے مارو!' اس واقعے نے مجھے ایسا سبق سکھایا، جو ساری زندگی میرے کام آتا رہا اور پھر زندگی بھر کسی زیردست پر میرا ہاتھ نہیں اٹھ سکا۔

مدرسے بھیجنے سے قبل گھر پر ہی ابّا جان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

> میرا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے، جس میں (۱۳۰۰) تیرہ سو برس تک سلسلۂ ارشاد و ہدایت اور فقر و درویشی جاری رہا ہے۔ اس خاندان کے ایک نامور بزرگ مولانا ابو احمد ابدال چشتیؒ [م: ۹۶۵ء] 'حضرت حسن مثنیٰؒ بن حضرت امام حسنؓ کی اولاد سے تھے۔ خواجہ ناصر الدین ابو یوسفؒ کے فرزند اکبر خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ تھے' جو تمام سلاسل چشتیہ ہند کے شیخ الشیوخ اور خاندان مودودی کے مورث اعلیٰ ہیں۔
> اس زمانے میں انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے خلاف مسلمانوں میں جو شدید نفرت پھیلی ہوئی تھی' اس کا حال سب جانتے ہیں مگر ہمارا خاندان اس میں عام مسلمانوں سے بھی کچھ زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں مذہب کے ساتھ ساتھ مذہبی پیشوائی بھی شامل تھی۔ ابا جان اور والدہ ماجدہ دونوں کی زندگی ایک ہی مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ ان کی اس تربیت اور عملی نمونے کا یہ اثر تھا کہ ابتدا ہی سے میرے دل و دماغ پر مذہب کے گہرے نقوش مرتسم ہو گئے۔ والد مرحوم نے اول دن سے اردو اور فارسی کے ساتھ عربی زبان' فقہ اور حدیث کے درس پر ڈال دیا'۔

ابا جان نے اپنے ایک نامور استاد کے بارے میں بتایا:

> 'اس زمانے میں دہلی میں مولانا عبدالسلام نیازیؒ صاحب [م: ۱۹۵۴ء] فلسفہ و معقولات (ریاضی و منطق وغیرہ) کے ماہر تھے۔ نہایت شیوہ بیان وطلیق اللسان' کہ گھنٹوں ان کی گفتگو سن کر بھی آدمی سیر نہیں ہوتا تھا۔ میرے والد ماجد کے بہت

عقیدت مند تھے۔ والد صاحب مرحوم نے میرے بچپن ہی میں ان سے کہہ دیا تھا کہ اسے عربی پڑھانا۔ چنانچہ بچپن میں بھی میں نے ان سے پڑھا تھا۔ جب والد مرحوم نے دبی زبان سے پوچھا کہ آپ پڑھانے کا معاوضہ کیا لیں گے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ 'میں علم بیچتا نہیں ہوں' (واہ' کیا زمانہ تھا وہ بھی! آج تو ٹیوشن سنٹر کے نام سے گلی گلی علم کی چھابڑیاں لیے استاد بیٹھے علم بیچ رہے ہیں!) الغرض وہ تعلیم و تدریس کا کوئی معاوضہ قبول نہ کرتے تھے۔ پھر الجمیعۃ دہلی کی ادارت کے زمانے میں جب ان سے عرض کیا کہ 'کچھ کتابیں رہ گئی ہیں' انھیں پڑھنا چاہتا ہوں' تو فوراً مان گئے۔ فرمایا: 'صبح کی اذان کے وقت میرے مکان پر آ جایا کرو۔ ان کا مکان' ہمارے مکان سے کافی دور تقریباً ڈیڑھ میل [دو کلومیٹر] کے فاصلے پر ترکمان دروازے کے قریب تیلیوں کی گلی میں تھا۔ میں باقاعدگی سے صبح کی اذان کے ساتھ ہی ان کے دروازے پر موجود ہوتا۔ کسی روز اگر ان کی طبیعت [پڑھانے پر] آمادہ نہ ہوتی تو اندر ہی سے فرما دیا کرتے: 'بھئی سید بادشاہ' آج طبیعت حاضر نہیں ہے' کل آنا'۔

تقریباً اسی زمانے میں دہلی کے ایک کرخندار (کارخانے دار) نے بھی مولانا عبدالسلام نیازی سے فرمائش کی کہ: 'آپ سب کو پڑھاتے ہیں' مگر میرے بیٹوں کو نہیں پڑھاتے'۔۔۔۔ اس پر مولانا نے جواب میں کہا: 'کیا کروں تیرے لونڈوں کے سر میں بھیجا ہی نہیں ہے! تو انھیں بھاڑے کے ٹٹوؤں [ٹیوشن پڑھانے والوں] سے پڑھوا' میں انھیں نہیں پڑھا سکتا'۔

مولانا [عبدالسلام] مرحوم سلسلۂ چشتیہ سے وابستگی رکھتے تھے۔ 'نیازی' کی نسبت بھی ایک بزرگ نیاز احمدؒ بریلوی سے عقیدت کی بنا پر تھی ۔۔۔۔ وہ بزرگ بھی چشتی تھے۔ [چونکہ] ہمارا خاندان ہندستان میں سلسلۂ چشتیہ کا پیش رو ہے اس بنا پر سن رسیدگی اور استاد ہونے کے باوجود [مولانا نیازی مرحوم] میری بہت عزت کرتے تھے' اور اسی بنا پر مجھے 'سید بادشاہ کہہ کر پکارتے تھے'۔

یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے' جب ابا جان رات کے تیسرے پہر نیند سے بیدار ہوتے اور مغل بادشاہ شاہ جہان کے دور سے آباد دہلی کے قدیم کوچہ پنڈت سے چل کر مولانا نیازیؒ کے دروازے پر جا دستک دیتے! کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے ہندستان میں معقولات (فلسفہ' منطق اور ریاضی) کے علوم اور عربی ادب میں کوئی شخص بھی ان کا ہمسر نہ تھا۔ آزاد منش آدمی تھے۔ زندگی

بھر کسی کی ملازمت نہ کی۔ عطر بنا کر اپنا رزق کماتے تھے اور خانقاہوں میں قوالیاں سنتے تھے۔ تعلیم و تدریس کا کوئی معاوضہ قبول نہ کرتے تھے۔ باری تعالیٰ نے اس نابغۂ روزگار استاد کو ابا جان کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنایا، جنھیں نہ تو دیوبند، ندوۃ العلما یا مدرسہ مظاہر العلوم سے تحصیل علم کا موقع ملا اور نہ والدِ گرامی کی وفات کے سبب سے وہ علی گڑھ پڑھنے جا سکے۔ بہت سے علماے کرام نے والد محترم کو صرف اس بنا پر عالمِ دین تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ نہ وہ کسی دار العلوم سے تعلق رکھتے تھے اور نہ کسی یونی ورسٹی ہی سے فارغ التحصیل تھے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے کہ آج دنیا کی بڑی بڑی یونی ورسٹیوں میں ان کی تصانیف اور ان کے فکر اور ان کی برپا کردہ تحریک پر ریسرچ ہو رہی ہے اور تحقیقی مقالات لکھے جا رہے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد مولانا عبدالسلام نیازیؒ کے ایک شاگرد نے، جو دہلی میں مقیم تھے، پاکستان آنے کا ارادہ کیا۔ آخری ملاقات کے لیے مولانا نیازیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: 'لاہور جا رہا ہوں'۔

مولانا عبدالسلام نیازیؒ نے انھیں ہدایت کی:

'لاہور جا رہے ہو تو وہاں میرے شاگرد، دو بھائی رہتے ہیں، سید ابوالخیر مودودیؒ [۲۵ دسمبر ۱۸۹۹ء - ۲۸ اگست ۱۹۷۹ء] اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ان سے ضرور ملنا۔ پہلے چھوٹے کے پاس جانا اور پھر بڑے کے پاس۔ اس کے بعد لاَ اِلٰہ اِلاَّ اللہ کے معانی پر غور کرنا'۔

مولانا نیازی مرحوم کے بات کرنے کا یہی انداز تھا۔

آیئے، دیکھیں کہ اس گھر کے مکین اور اس کے باسی کیسے تھے۔ ایک ایسا انسانِ مطلوب کہ جس کے بارے میں اپنے دور ہی کی ایک عبقری شخصیت نے مذکورہ بالا بات کہی تھی اور پھر علامہ محمد اقبال کے یہ اشعار پڑھیے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

دسمبر ۱۹۲۶ء کی آخری تاریخوں میں 'شدھی تحریک' کا بانی سوامی شردھانند ایک مسلمان [قاضی عبدالرشیدؒ] کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس قتل پر بعض ہندو بھائیوں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا کہ اسلام خوں ریزی سکھاتا ہے۔ مسٹر گاندھی [م:۱۹۴۸ء] نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ 'اسلام کی فیصلہ کن چیز پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے'۔

اس حوالے سے ابا جان لکھتے ہیں: 'یہ غوغا آرائی ایک مدت تک بڑے زور وشور سے جاری رہی۔ مولانا محمد علی جوہرؒ [م: ۴ جنوری ۱۹۳۱ء] نے ان سے تنگ آکر جامع مسجد دہلی میں جمعے کا خطبہ دیتے ہوئے آبدیدہ ہو کر کہا: 'کاش کوئی اللہ کا بندہ ان الزامات کے جواب میں اسلام کے صحیح تصور جہاد پر ایک مبسوط کتاب لکھے اور اس میں جہاد کے خلاف اٹھائے ہوئے تمام اعتراضات کے مدلل جواب دے'۔ خطبہ سننے والوں میں' ایک میں بھی تھا۔ میں جب وہاں سے اٹھا تو یہ سوچتا ہوا جامع مسجد کی سیڑھیاں اترنے لگا کہ کیوں نہ میں ہی اللہ کا نام لے کر اپنی سی کوشش کروں۔

۱۹۲۷ء میں ابا جان نے **الجهاد فی الاسلام** کے حوالے سے **اخبار الجمیعة**، دہلی میں قسط وار لکھنا شروع کیا۔ جب اخبار کے صفحات اس بحث کے متحمل نہ ہوئے تو ان مباحث کے لیے الگ سے پوری کتاب لکھی۔ اس وقت ابا جان کی عمر صرف ۲۴ برس تھی۔ اس معرکہ آرا کتاب میں ابا جان نے جہاد کی اصل نوعیت اور اہمیت تحقیقی طور پر واضح کر دی۔[1] انھوں نے ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت کیا کہ اسلامی جہاد' اللہ تعالیٰ کی راہ میں حق اور صداقت کے لیے مربوط' منظّم اور مسلسل کوشش کا نام ہے۔ یہ ہرگز کوئی جارحانہ یا ظالمانہ قتل وغارت گری نہیں ہے۔ یہ مظلوموں کا دفاع ہے' کوئی خفیہ تخریب کاری نہیں ہے۔ یہ تعمیر وترقی کے لیے انتہائی کوشش کا نام ہے' کوئی زیرزمین تحریک نہیں ہے۔ یہ جنگ و امن کا اسلامی قانون ہے۔ ایک اسلامی مجاہد' دشمنوں کا بھی محافظ و پشت پناہ بن کر دیارِ غیر میں قدم رکھتا ہے۔ وہ قیدیوں کے ساتھ انسانی برتاؤ کرتا ہے اور عورتوں' بچوں' بوڑھوں اور بیماروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا اور عبادت گاہوں کو ہر قسم کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔

---

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی **الجهاد فی الاسلام**، ناشر: دارالمصنفین' اعظم گڑھ' طبع اول' ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۳۰ء

اسلامی جہاد کی یہ صحیح تصویر آج کی نام نہاد مہذب اور روشن خیال کہلانے والی غیر مسلم طاقتوں کو اسی طرح تہذیب اور احترامِ آدمیت کا سبق دیتی ہے، جس طرح ماضی کے انتہائی طاقت ور اور متمدن ملکوں کو اس نے انسانیت کا درس دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جنگ اور امن کے جتنے بھی مہذب قوانین جو 'جنیوا کنونشن' اور 'اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل' نے متعارف کرائے ہیں، وہ سب اسلامی جہاد کے اصولوں سے حاصل کیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں جہاد اسلامی کے خلاف یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے منفی اور ظالمانہ پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب دیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ مسئلہ ماضی میں بھی موضوع بحث بنا رہا ہے اور آج بھی دنیا میں وقت کا سب سے اہم موضوع بنا ہوا ہے۔ مگر افسوس کہ اس کی اصل حقیقت مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہے۔ **الجہاد فی الاسلام** کتابی صورت میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی تو اسے پڑھ کر علامہ محمد اقبالؒ نے فرمایا: 'اسلام کے نظریۂ جہاد اور اس کے قانون صلح و جنگ پر یہ ایک بہترین تصنیف ہے اور میں ہر ذی علم آدمی کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کا مطالعہ کرے'۔ یہی کتاب بے مثل فلسفی، شاعر اور مفکرِ اسلام علامہ اقبالؒ کے ساتھ ابا جان کے تعارف اور تعلق کا باعث بنی، یہاں تک کہ علامہ محمد اقبالؒ نے ۱۹۳۷ء میں ابا جان کو لاہور بلایا، تاکہ پوری یکسوئی کے ساتھ اطمینان سے بیٹھ کر جہاد، اجتہاد اور علم و تربیت کی جملہ سرگرمیوں کو آگے بڑھایا جا سکے۔[۲] گویا قدرت نے اگلے ہی سال علامہ اقبال کی وفات [م: ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء] سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنا ابا جان کے مقدر میں لکھ دیا تھا۔

یہ لاہور کی سرزمین بھی عجب سرزمین ہے، جو کبھی صوفیا، صلحا اور زہاد سے خالی نہیں رہی۔ سید علی ہجویریؒ [۱۰۰۹ء-۱۰۷۲ء] معروف بزرگانِ دین میں سے ہیں، جن سے اس ملک کی کثیر آبادی گہری عقیدت رکھتی ہے۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ [م: ۱۳۳۵ء] روایت کرتے ہیں کہ سید ہجویریؒ اپنے مرشد کی ہدایت پر اللہ کے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے سلطان محمود غزنویؒ [م: ۸ اپریل ۱۰۳۰ء] کے بیٹے ناصر الدین مسعودؒ [م: ۱۰۴۰ء] کے زمانے میں لاہور

---

(۲) ڈاکٹر جاوید اقبال زندہ رود، سوم، ص ۶۱۳۔ ● سید ابوالاعلیٰ مودودی: خطوطِ مودودی، دوم (بنام نیاز علی خاں، ص ۱۴۱-۱۵۴، اور بنام سید نذیر نیازی، ص ۱۸۰-۱۹۲) مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی، سلیم منصور خالد۔ ● آباد شاہ پوری تاریخ جماعت اسلامی، اول ● اسعد گیلانی: اقبال، دار الاسلام اور مودودی۔

تشریف لائے تھے۔ آپ سے پہلے آپ کے پیر بھائی جناب حسین زنجانیؒ یہاں خدمت دین پر مامور تھے۔ جب سید علی ہجویریؒ کو لاہور آنے کا حکم ہوا تو انھوں نے شیخ سے عرض کیا کہ وہاں حسین زنجانیؒ موجود ہیں' میری کیا ضرورت ہے؟' لیکن شیخ نے فرمایا: 'نہیں تم جاؤ'۔ سید ہجویریؒ فرماتے ہیں: 'میں رات کے وقت لاہور پہنچا تو فصیل کا دروازہ بند ہو چکا تھا' اس لیے رات شہر کے باہر گزاری۔ صبح کو جب فصیل کا دروازہ کھلا تو سب سے پہلے حضرت حسین زنجانیؒ کا جنازہ شہر سے باہر لایا گیا'۔ سید علی ہجویریؒ کا مرکز رشد و ہدایت اور پھر مدفن لاہور ہی بنا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کئی صدیوں بعد 'سید علی ہجویریؒ کی نگری' لاہور میں ایک اور زاہد شب زندہ دار' فاتح تختہ دار' گو ہر شب چراغ ہجرت کر کے آتا ہے اور چراغ سے چراغ روشن کرتے ہوئے اسلام کو نظام غالب بنانے کی ایک ہمہ گیر تحریک اٹھاتا ہے۔ جس طرح مغربی تہذیب یہاں سیلاب کی مانند در آئی اور زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہو گئی تھی' اس کے ہمہ گیر طغیان کا توڑ اس کے بغیر ممکن نہیں تھا کہ تعلیمی' سیاسی اور معاشی میدانوں میں مثبت انداز سے ایک صالح انقلاب کی بنیاد رکھی جائے۔ چنانچہ خود اباجان ہی کے الفاظ ہیں:

> مسلمانوں کی مغرب سے سیاسی و عسکری شکست سے بڑھ کر خطرناک ترین بات ان کا مغربی تہذیب و ثقافت اور فلسفے کے سامنے سپر ڈال دینا ہے' اس لیے کہ سیاسی غلبے نے صرف جسموں کو فتح کیا تھا' جب کہ اس کی تہذیبی اور فکری یلغار نے تو دل و دماغ اور فکر کا دھارا ہی بدل کر رکھ دیا۔ انگریزی علم و ادب' فلسفے اور تہذیب و تمدن نے ہم مسلمانوں کے اندر ایسے اشخاص پیدا کر لیے ہیں، جن کے ذہن پوری طرح اس کے قبضے میں ہیں۔ یہ لوگ اپنی زندگیوں کو اس طریقے سے ہٹ کر گزارنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے، جس کا نقشہ مغرب نے ان کے سامنے پیش کیا ہے۔

اباجان نے جامعہ عثمانیہ' حیدر آباد دکن میں تقرر کی پیش کش اپنے اصول کی خاطر مسترد کر دی تھی' حالانکہ اس دور میں وہ شدید معاشی مشکلات سے دوچار تھے۔

الجہاد فی الاسلام کی تصنیف سے پہلے وہ **گیتا' رامائن اور مہابھارت** وغیرہ اچھی طرح پڑھ چکے تھے۔ **بائبل** اور **تلمود** بھی پڑھ ڈالی تھی۔ مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ کے ہاں **جامع ترمذی** اور **موطا امام مالکؒ** کے درس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا شمار کثیر التصانیف مصنفین میں ہوتا ہے۔ ابا جان نے قرآن، حدیث، فقہی علوم، تاریخِ اسلامی، سیاسیات، معاشیات اور عمرانیات جیسے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا۔ تصانیف کی کثرت کے باوجود معیار کو برقرار رکھا۔ اس کے ساتھ ہی عربی ادب و انشا، فلسفے اور منطق میں بھی یدطولیٰ رکھتے تھے۔ مزید برآں جو اطمینانِ قلب، رضا بہ قضا اور دل کی سکینت انھیں میسر تھی وہ باری تعالیٰ کی خاص دین تھی۔

جب کفر والحاد کے منہ زور جھکڑوں کے سبب ایمان وایقان کے چراغ ایک ایک کر کے گل ہوتے جا رہے تھے تو ابا جان نے اپنی زندگی کی موم بتی کو دونوں سروں سے جلا کر افکار کی دنیا بدل کر رکھ دی اور جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور ذہنی غلامی سے نجات دلائی۔ آج کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو اپنے دین پر فخر کرنا سکھایا۔ انھوں نے تفہیم القرآن کے ذریعے جدید تعلیم یافتہ طبقے کا تعلق قرآن سے جوڑ کر ان کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ علامہ اقبال کے بقول:

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

[یہ قرآن جب دل کے اندر داخل ہو جاتا ہے تو انسان بدل جاتا ہے، اور جب انسان ہی بدل جاتا ہے تو یہ سارا جہان بدل جاتا ہے۔]

جیسا کہ ہر دور کے کچھ مخصوص فتنے ہوتے ہیں، اسی طرح ہمارے دور کا سب سے بڑا فتنہ پڑھی لکھی جاہلیت ہے۔ مراد یہ کہ جدید تعلیم یافتہ افراد جو صرف اپنے کسی مخصوص میدان کار میں ڈگری حاصل کر لیتے ہیں، ان کے سر میں دین کے بارے میں یہ سودا سما جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے افلاطون یا بقراط ہیں، بلکہ ان سے بھی بڑھ کر کچھ ہیں، لیکن ابا جان کی کتابیں پڑھ کر ان حضرات کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ محض طفل مکتب ہیں۔ جب سب بستروں پر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے تھے، اس وقت وہ زاہد شب زندہ دار، اپنے خونِ جگر سے ایسی کتابیں تصنیف کر رہا ہوتا تھا، جو اُمت محمدی کو دنیوی اور اخروی زندگی میں کامیابی کی راہ دکھانے والی تھیں۔

ابا جان کی شادی

جب ہماری اماں جان [محمودہ بیگم مرحومہ] کی عمر تقریباً بارہ برس تھی، انھوں نے ایک خواب دیکھا کہ میں نے مٹی میں اپنا پاؤں رکھ کر اوپر سے مٹی دبا دبا کر، ایک گھروندا بنایا اور پاؤں باہر کھینچ کر، اس گھروندے میں ہاتھ ڈالا تو ایک بڑا چمک دار ہیرا میرے ہاتھ آیا۔ اس ہیرے پر نگاہ نہیں ٹھیرتی تھی۔ اتنے میں چاروں طرف سے لوگ دوڑتے ہوئے آئے، وہ کہہ رہے تھے: یہ ہیرا بہت قیمتی ہے، تمھیں کہاں سے ملا ہے؟ ایک نے کہا: 'اس نادر ہیرے کو سنبھال کر رکھنا، کہیں کوئی اسے تم سے چھین نہ لے'۔ صبح ہوتے ہی اماں جان نے یہ خواب نانا ابا سید نصیر الدین شمسیؒ کو سنایا۔ انھوں نے یہ خواب کسی اور کو سنانے سے منع کیا اور دہلی کے ایک جیّد عالم سے تعبیر پوچھنے چلے گئے۔ انھوں نے کہا: 'اس لڑکی کی شادی ایک بڑے عالم دین سے ہوگی، جس کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیلے گی'۔

نانا ابا، معاشی اعتبار سے خاصے خوش حال اور سماجی حیثیت میں دہلی کے معروف اور بلند مرتبہ لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ اسی مناسبت سے میری والدہ محترمہ کے لیے دہلی کے بڑے صاحبِ ثروت اور عالی مرتبت خاندانوں سے رشتے آئے، مگر نانا ابا کی نگاہ میں کوئی سمایا نہیں۔ لیکن جب دادی اماں، ابا جان کا رشتہ لے کر آئیں تو نانا ابا کو گویا مَن کی مراد مل گئی۔

ابا جان کی زندگی کا بیش تر حصہ مسلسل سفر، نقل مکانی یا معاشی عدمِ استحکام میں گزر رہا تھا۔ وہ بڑے صاف گو انسان تھے، اسی لیے انھوں نے شادی سے پہلے، نانا ابو کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے آگاہ کر دیا: 'میرا نصب العین یہ ہے، جس پر میں کوئی مصالحت نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو ایک اچھا گھر بھی بنا لوں گا، کیونکہ سب کچھ ہوتے سوتے خراب حالات میں رہنے کا قائل نہیں ہوں۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے معاشی کشادگی نہ دی تو خستہ حالی میں بھی اپنے مشن کو نہیں چھوڑوں گا'۔ اس بات کا جواب ہمارے نانا جان کے والد گرامی نے خط کے ذریعے دیا اور روانہ کرنے سے قبل اماں جان اور ہمارے نانا ابا اور نانی اماں کو سنایا۔ اماں جان کے بقول اس خط میں لکھا تھا: 'ہماری بیٹی محل میں بھی تمھارا ساتھ دے گی اور جھونپڑے میں بھی تمھارے ساتھ رہے گی'۔ اماں جان کہتی تھیں: 'دادا ابا کا یہ جملہ ساری زندگی میرے کانوں میں گونجتا اور میرے عزم

اور ارادے کو تقویت دیتا رہا ہے'۔

۱۵ مارچ ۱۹۳۷ء کو اماں جان کی شادی دہلی میں ابا جان سے ہوگئی۔ مہر کی رقم دو ہزار تھی۔ ابا جان نے صاف کہہ دیا تھا: 'مہر ادا کرنے کے لیے ہوتا ہے' اس لیے مقررہ مہر سے زیادہ ادا کرنے کی حیثیت نہیں رکھتا'۔ بَری میں ایک ساڑھی اور ایک انگوٹھی آئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی کے شرفا میں سوالاکھ سکہ رائج الوقت مہر لکھا جاتا تھا' لیکن ادا کرنے کا کوئی رواج نہیں ہوتا تھا۔

دارالاسلام

زآب و گل خدا خوش پیکرے ساخت
جہانے از ارم زیبا ترے ساخت
ولے ساقی بآں آتش کہ دارد
زِ خاکِ من جہانِ دیگرے ساخت

(اللہ تعالیٰ نے پانی اور مٹی سے خوب صورت پیکر [انسان] بنایا' ایک جہان جنت سے بھی زیادہ خوب صورت تشکیل دیا' مگر ساقی نے اس آگ کی بدولت' جو اس کے پاس ہے میری مٹی سے ایک اور ہی جہان بنالیا۔)

جموں کے پہاڑی سلسلے کے اختتام پر پٹھان کوٹ کا شہر آباد ہے۔ پٹھان کوٹ کے نواح میں ایک گاؤں 'سرنا' ہے جس کے قریب چودھری نیاز علی خاںؒ (م: ۲۴ فروری ۱۹۷۶ء جوہرآباد) کا ایک وسیع رقبہ تھا۔ جہاں پر انھوں نے علامہ محمد اقبالؒ کے مشورے سے ایک ٹرسٹ قائم کیا تھا۔ ابا جان نے اس ٹرسٹ کا نام 'دارالاسلام' تجویز کیا تھا۔

میں نے اسی دارالاسلام میں شعور کی آنکھ کھولی اور بچپن کے کچھ برس یہیں گزارے۔ نہایت سرسبز و شاداب اور خوب صورت مقام تھا۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر مادھوپور کا ہیڈورکس تھا۔ سامنے پہاڑوں پر پڑی برف نظر آتی تھی۔ جیسے جیسے سورج بلند ہوتا' برف اپنے رنگ بدلتی جاتی تھی۔ پھر جوں ہی سورج ڈھلتا' برف سفید دودھیا سے رفتہ رفتہ گہرے نارنجی رنگ اختیار کرتی جاتی اور سورج غروب ہونے کے بعد تک شفق کے رنگوں میں نیرنگی نظر آتی تھی۔ غرض

یہ کہ قدرت کی رعنائیاں بھرپور طریقے سے وہاں نظر آتی تھیں۔ شہروں کی کوئی سہولتیں وہاں موجود نہیں تھیں۔ بجلی کے قمقموں اور پانی کی سپلائی کے لیے نلکوں کا وہاں تصور بھی نہ تھا۔ گھر بھی بہت سیدھا سادہ سا تھا، لیکن اس کے باوجود ابا جان سے جو بَن پڑا، اپنے محدود وسائل میں آرام مہیا کیا اور ہر طرح سے ہماری اماں جان کی دل جوئی کی۔ ہماری والدہ جو دہلی کے ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں، انھوں نے بڑے صبر اور حوصلے سے وہاں ابا جان کا ساتھ بڑی خوش دلی سے دیا۔ ابا جان نے وہاں آمدورفت کے لیے گھوڑا تانگا خریدا، جسے ایک ترکستانی کوچوان تُختہ بیگ چلاتے تھے۔ دہلی سے ایک ماہر خانساماں کو لے کر آئے۔ ایک آیا، بچوں کو سنبھالنے میں اماں جان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ یہ تینوں ملازم بے حد جان نثار اور خیر خواہ تھے۔ خانساماں کا نام مقبول تھا۔ اماں جان روزانہ صبح کے وقت آیا کو ہدایات دے دیتی تھیں کہ کیا پکانا ہے۔ آیا، خانساماں کو بلا کر بتاتی تھی اور ساری ضروری اجناس اس کے حوالے کر دیتی تھیں۔ دوپہر اور رات کو خانساماں ہنڈیا پکا کر ڈائننگ روم سے متصل کمرے میں لا کر رکھ دیتا تھا اور آیا، اماں جان کو بلا کر کھانا ان کے سپرد کر دیتی تھیں۔ یہ باورچی خانہ، گھر کے باہر تھا۔ اس لیے مقبول کبھی گھر کے اندر نہیں آیا تھا۔ تُختہ بیگ بھی گھر کے اندر کبھی نہیں آئے تھے۔ اس طرح ہم نے اپنے گھر کے اندر مرد ملازموں کا آنا جانا کبھی نہیں دیکھا تھا۔

''روڈ ٹو مکّہ'' کے مصنف علامہ محمد اسد صاحب [م: فروری ۱۹۹۲ء] اپنی بیگم منیرہ صاحبہ اور کم سن صاحبزادے طلال کے ہمراہ دارالاسلام آئے تھے۔ ہمارے والدین نے ان کو کھانے پر مدعو کیا۔ ہماری اماں جان نے اپنے جہیز کا ڈنر سیٹ نکالا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب بعض گھرانوں میں نفاست کا لحاظ رکھتے ہوئے گلاسوں کو اوپر سے جالی کے رومال سے ڈھکا جاتا تھا۔ جالی کے ان رومالوں کا توازن قائم رکھنے کے لیے موٹے موٹے مصنوعی موتی لٹکائے جاتے تھے۔ یہ اہتمام اس لیے کیا جاتا تھا کہ گلاسوں میں مکھیاں نہ گریں۔ مقبول نے اتنا اچھا کھانا پکایا اور اماں جان نے اتنا اچھا دستر خوان سجایا کہ علامہ محمد اسد اور ان کی بیگم بہت ہی خوش ہوئے اور اپنی عزت افزائی پر ہمارے والدین کا شکریہ ادا کیا۔ انھی دنوں انڈین نیشنل کانگریس کے رہنما جواہر لال نہرو [م: مئی ۱۹۶۴ء] کا پرائیویٹ سیکرٹری بیمار ہو کر آرام کرنے اپنے گاؤں آیا۔ اس کا گاؤں سرنا کے قریب تھا۔ اس نے اپنے آس پاس کے لوگوں سے ابا جان کا چرچا سنا تو وہ اپنے

چند ہندو دوستوں کے ساتھ دارالاسلام آیا۔ ابا جان سے ملاقات کے دوران اس نے بڑے چبھتے ہوئے سوالات کیے۔ اسلام اور مسلمانوں کے اوپر تابڑتوڑ حملے کیے۔ لیکن جب ابا جان نے اس کے سارے سوالوں کے جوابات انتہائی تحمل اور ٹھنڈے دل سے دیے' تو وہ لاجواب ہو کر رہ گیا۔ وہ ابا جان کے تحمل اور استدلال سے اور اس بات سے بھی بہت متاثر ہوا کہ ابا جان اس کے تند و تیز اعتراضات اور اشتعال انگیز لب و لہجے کے باوجود قطعی مشتعل نہیں ہوئے تھے۔ بعد میں اس نے اپنے احباب سے کہا کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر تنظیم اور علم و فضل ہے اور وہ اتنے بیدار مغز ہیں۔ جب اس دُور افتادہ چھوٹے سے گاؤں میں ایسے ایسے اسکالر بیٹھے ہیں اور ان میں اتنی خود اعتمادی ہے تو بڑے بڑے شہروں کا کیا حال ہوگا؟ اس طرح دارالاسلام سے جاتے ہوئے وہ کانگریسی برہمن سخت تشویش میں مبتلا ہوا۔

اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد' دارالاسلام میں ایک اجلاس میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب [م: ۱۹۹۷ء] اور مولانا جعفر شاہ پھلواروی صاحب [م: یکم اپریل ۱۹۸۲ء] کے ہمراہ چند علما تشریف لائے اور دارالاسلام میں ایک ڈیڑھ ہفتے کے لیے قیام پزیر ہوئے۔ ابا جان نے انھیں اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا اور احتیاط برتتے ہوئے اماں جان کو ہدایت کی 'کہ تانبے کی جن پلیٹوں میں ہم روزانہ خود کھانا کھاتے ہیں مہمانوں کے لیے بھی بس انھی کو دسترخوان پر چنا جائے'۔ انھوں نے اماں جان کو ہدایت کی کہ اپنا شادی کا ڈنر سیٹ نہ نکالنا اور نہ گلاسوں کو موتیوں والے رومالوں سے ڈھکنا۔ اماں جان نے اصرار کیا کہ اتنے بڑے علمائے دین میرے گھر آئیں اور میں ان کی عزت افزائی اور اکرام کے لیے اپنے اچھے برتن بھی نہ نکالوں اور بس تانبے کے برتنوں میں انھیں کھانا کھلا دوں؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے!'

اسی طرح ابا جان نے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ زیادہ پُرتکلف کھانا نہ پکوانا' بس وہی دال دلیا جو ہم روزانہ کھاتے ہیں دسترخوان پر رکھنا۔ اماں جان پھر تڑپ اٹھیں: 'اگر ہم بھی اپنے دینی حلقوں کو عزت نہیں دیں گے تو عام لوگوں سے اس کی کیسے توقع کریں گے؟'

الغرض مقبول نے بہت اچھا' پُرتکلف کھانا پکایا اور ہماری اماں جان نے اپنے بہترین برتنوں سے دسترخوان سجایا۔ مہمان تشریف لائے' کھانا کھایا اور چند روز بعد چہ می گوئیاں شروع

ہو گئیں، جن کا انجام جماعت اسلامی سے ان کے استعفا کی صورت میں سامنے آیا۔ حضرات گرامی نے اپنے دائیں بائیں ملنے والوں سے فرمایا: مولانا مودودی دین داری کے پردے میں دنیادار آدمی ہیں۔ مولانا کے گھر میں خانساماں کھانا پکاتا ہے۔ بچے آیا پالتی ہے۔ یہ بیوی آخر کس مرض کی دوا ہے؟ سنا ہے کہ مولانا کی بیوی کبھی ساڑھی پہنتی ہیں اور کبھی غرارہ۔ پان لگانے کے لیے مولانا کا پان دان چاندی کا ہے۔ پان جس ڈبیا میں رکھے جاتے ہیں، وہ بھی چاندی کی ہے (حالانکہ یہ چاندی کے نہیں، تانبے کے تھے، جن پر قلعی کی ہوئی تھی)۔ آیا، مولانا کے بچوں کو بچہ گاڑی میں سیر کرانے لے جاتی ہے۔ یہ سب دین داری کے نام پر دھوکا نہیں تو اور کیا ہے۔

دادی اماں [محترمہ رقیہ بیگم: ۱۸۷۳ء- ۷ دسمبر ۱۹۵۷ء] نے یہ باتیں سنیں تو چھوٹتے ہی کہا: 'اللہ تعالیٰ بھی تو قد دیکھ کر جامہ دیتا ہے۔ بس اتنا ہی ظرف ہے!' اس واقعے کے بعد سے اماں جان نے کبھی ابا جان سے اختلاف کر کے اپنی بات نہیں منوائی۔ انھیں ہمیشہ اس بات کا پچھتاوا رہا کہ اگر میں ان کی ہدایت کے مطابق سیدھا سادہ کھانا پکواتی اور تانبے کی پلیٹیں دستر خوان پر رکھتی تو جماعت کو اتنا بڑا دھچکا نہ لگتا۔ شاید اسی حادثے کی وجہ سے ہم نے اپنی زندگی میں اپنے والدین کے درمیان کبھی سخت جملوں کا تبادلہ یا تلخ نوائی کا اظہار نہیں دیکھا۔ البتہ، ایک واقعہ ایسا ضرور ہے جب اماں جان اور دادی اماں نے ابا جان سے سخت اختلاف کیا۔ یہ اگست ۱۹۴۷ء کے وہ دن تھے، جب فرقہ وارانہ فسادات عروج پر تھے۔ ابا جان اور دارالاسلام کے کارکنوں کا رعب و دبدبہ اس قدر تھا کہ آس پاس کے ہندووں اور سکھوں کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ دارالاسلام کے حدود میں قدم بھی رکھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مضافات کے دیہات سے لوگ اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر، اپنے بیوی بچوں اور مویشیوں کے ساتھ دارالاسلام میں پناہ لینے کے لیے آ گئے تھے۔ پورا علاقہ مسلمانوں سے پٹا پڑا تھا۔ متاثرین کی آمد کا اتنا دباؤ تھا، لیکن اس وقت فوج کی ہمراہی میں صرف تین بسیں لوگوں کو لینے کے لیے آئیں۔ ان میں سے بھی ایک بس، چودھری نیاز علی خاں صاحب کے گھر والوں کو لینے کے لیے بھیج دی گئی۔ اب صرف دو بسیں دارالاسلام والوں اور وہاں پہنچنے والے پناہ گزینوں کے لیے رہ گئیں۔

ابا جان نے فوری طور پر فیصلہ کیا: 'اس وقت صرف عورتیں اور بچے ان دو بسوں میں

چلے جائیں، مرد بعد میں جائیں گے۔ غضب یہ ہوا کہ جو فوجی جوان بسوں کے ساتھ آئے تھے، انھوں نے حکم صادر کیا: 'دس منٹ کے اندر اندر آپ لوگ بسوں میں بیٹھ جائیں، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے'۔ اس وقت دادی اماں اور اماں جان نے کہا: 'ہم مردوں کے بغیر اکیلے کیسے جائیں جبکہ قدم قدم پر سکھ کرپانیں لیے کھڑے ہیں'، تقریباً یہی سوال ہر گھر میں اٹھا ہوا تھا اور چونکہ ہمارا گھر نمونے کا گھر تھا، اس لیے سب کی نظریں اس گھر پر ٹکی ہوئی تھیں۔

ابا جان نے کہا: 'آس پاس دیہات کے مسلمان میرے پاس پناہ کے لیے آئے ہیں۔ میں انھیں کیسے بلوائی سکھوں اور ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر چلا جاؤں؟' ابا جان نے مزید یہ کہا: 'عورتوں اور بچوں کی موجودگی میں بہادر سے بہادر مرد بھی بزدلی دکھا کر جان بچانے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کے جانے کے بعد ہم عزتیں بچانے کی فکر سے تو آزاد ہو جائیں گے۔ باقی رہیں ہماری اپنی جانیں تو جو اللہ کو منظور ہوا وہی ہوگا، اس کی فکر نہ کریں'۔ اسی گومگو کی کیفیت میں وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ فوجی جوان سیٹیوں پر سیٹیاں بجا رہے تھے۔ بالآخر ابا جان نے بڑے مصمم لہجے میں اماں جان سے کہا: 'جب تک آخری آدمی یہاں سے پاکستان نہیں چلا جاتا، میں یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں'۔ یہ سنتے ہی دادی اماں نے اپنا قرآن شریف گلے میں ڈالا اور وضو کا لوٹا ہاتھ میں لیا اور اماں جان کے ساتھ بچوں کے ہاتھ پکڑ کر ستے ہوئے چہروں، بھینچے ہوئے ہونٹوں اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ بس میں سوار ہو گئیں۔ جیسے ہی دادی اماں اور اماں جان بس میں بیٹھیں، باقی گھروں کی خواتین اور بچے بھی سوار ہو گئے۔ جب بسیں چلیں تو کچھ لوگ بے اختیار ہو کر ساتھ ساتھ دوڑنے لگے، لیکن ہم نے مڑ کر کھڑکی سے دیکھا کہ ابا جان، چٹان کی طرح جمے اپنی جگہ پر خاموش کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے!

عصر اور مغرب کے درمیان یہ بسیں سرنا سے روانہ ہو کر رات کے وقت امرتسر پہنچیں اور پوری رات وہاں کھڑی رہیں۔ کیونکہ اندھیرے میں سفر خطرناک تھا۔ آدھی رات کو دادی اماں حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے لیے، سب کے روکنے کے باوجود اصرار کر کے بس سے اتر گئیں۔ جب کافی دیر ہو گئی اور دادی اماں نہیں آئیں اور سب لوگ مایوس ہو گئے تو اچانک ایک

عجیب واقعہ رونما ہوا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دو سکھ دادی اماں کا ہاتھ پکڑے لیے چلے آ رہے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ 'اماں جی پہچانیے آپ کی بس کون سی ہے'۔ ہم نے فوراً آواز دی: 'دادی اماں ادھر آ جائیے'۔ غرض دونوں سکھ سہارا دے کر اماں جی کو بس میں چڑھا کر سلام کر کے روانہ ہو گئے۔ ایک کے ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا تھا' وہ بھی اس نے کھڑکی سے اماں جی کو پکڑا دیا۔ بعد میں دادی اماں نے ہم سے کہا: 'تم لوگ خواہ مخواہ سمجھتے ہو کہ سکھ مارتے ہیں' حالانکہ مارنے جلانے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے'۔

ابا جان نے' احتیاطاً دارالاسلام ہی سے جماعت اسلامی کے ایک بزرگ مولانا عبدالجبار غازی صاحب [م: ۱۹۸۱ء] کو ہمارے قافلے کے ساتھ بھیجا اور ان کو ہدایت کر دی تھی کہ بسیں لے کر سیدھے گوال منڈی' لاہور میں ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب [م: ۲ جولائی ۱۹۷۶ء] کے گھر چلے جائیں اور بعد میں ہم لوگوں کو تانگے میں اسلامیہ پارک' فصیح منزل میں مولوی ظفر اقبال صاحب [م: ۵ مئی ۱۹۸۵ء] کے گھر پہنچا دیں۔ اسی طرح ابا جان نے عبدالجبار غازی صاحب کو اس بات کا بھی پابند کیا کہ سب خواتین کو ان کے رشتے داروں کے گھر پہنچا دیں۔

ہم فصیح منزل میں چند روز تک رہے۔ اس عرصے میں ابا جان کی طرف سے کوئی بھی اطلاع نہیں آئی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ ہر دن دادی اماں اور اماں جان کے لیے ایک ایک صدی بن کر گزرتا تھا اور ہر رات قیامت کے مانند ہوتی تھی۔ اس پورے عرصے میں مولوی ظفر اقبال صاحب کے گھر والوں نے جس طرح ہماری خاطر مدارات' دل جوئی اور علاج معالجہ کیا' اس نے انصار مدینہ کی جانب سے مکے کے مہاجرین کی آؤ بھگت کی یاد تازہ کر دی۔

۱۹۴۷ء

اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کے بعد ہم دارالاسلام [پٹھان کوٹ' مشرقی پنجاب] سے ہجرت کر کے لاہور آئے' تو دارالاسلام کی غیر منقولہ املاک کے بدلے میں ہمیں اور جماعت اسلامی کو چوبرجی کے قریب سوہن لال کالج کی عمارت الاٹ کر دی گئی۔ دارالاسلام میں ہمارا گھر اور جماعت اسلامی کا دفتر اکٹھے ہی تھے۔ اس کالج میں پرنسپل کی کوٹھی

ہمیں دی گئی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کوٹھی کے مکین چائے پینے کے دوران اچانک یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے‘ کیونکہ پیالیوں میں چائے سوکھ چکی تھی۔ باورچی خانے میں آٹا خمیر ہوکر سوکھا پڑا تھا۔ الماریوں کے دروازے کھلے تھے اور سامان بکھرا پڑا تھا۔ گھر کی ایک ایک چیز سے حسرت ٹپک رہی تھی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی دادی اماں نے ہمیں سختی سے کہا: ’جس مال نے اپنے مالک سے وفا نہ کی‘ وہ ہم سے کیا وفا کرے گا‘ خبردار اس گھر کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا‘۔

ہم لوگ تقریباً دو ماہ تک اس عمارت میں رہے۔ اسی قیام کے دوران علامہ محمد اسد اپنی اہلیہ اور بیٹے کے ہمراہ ہم سے ملنے آئے۔ اسی کوٹھی کی تیسری منزل سے ہم نے قائداعظم مرحوم [م: ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء] کی وہ تقریر سنی تھی‘ جو انھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد پنجاب یونی ورسٹی گراؤنڈ کے جلسہ عام [۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء] میں کی تھی۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ابا جان‘ چودھری محمد علی صاحب [بعدازاں وزیراعظم پاکستان۔ م: یکم دسمبر ۱۹۸۰ء] سے جا کر ملے اور ان سے کہا: ’مسلم لیگ کے متعدد ذمے دار لیڈروں کی طرف سے پاکستان کو سیکولر انداز سے چلانے کی باتیں ہو رہی ہیں‘ یہ بات مظلوموں کے زخموں پر نمک پاشی اور شہیدوں کے خون سے بے وفائی کے مترادف ہے۔ پھر انھوں نے شہدا کی ان لاشوں کی طرف توجہ دلائی، جو لاہور کے ریلوے اسٹیشن کے چاروں طرف بے گور و کفن بکھری ہوئی تھیں اور جانور جن کی بے حرمتی کر رہے تھے (اس لیے کہ جن کا فرض تھا کہ وہ شہدا کی لاشوں کو دفناتے‘ ان میں سے اکثر تو ہندوؤں کی کوٹھیاں ہتھیانے اور ان کی دولت لوٹنے میں مصروف تھے)۔ ابا جان نے کہا: ’ابھی چند روز قبل شملے سے سرکاری ملازمین کی ٹرین لاہور پہنچی ہے، جس میں ایک آدمی بھی زندہ سلامت نہیں بچا اور اس ٹرین کے پہیوں سے خون کے لوتھڑے لٹک رہے تھے‘ ابھی تو مسلمانوں کی بیٹیاں سکھوں کے گھروں سے بازیاب نہیں ہوئیں‘ ابھی تو شہدا کی لاشیں تک نہیں دفنائی گئیں کہ پاکستان کو سیکولر ریاست بنانے کی باتیں شروع ہوگئی ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر اس لیے نکل کھڑے ہوئے تھے کہ آپ نے پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ لگایا تھا!‘

چودھری محمد علی صاحب نے کہا: ’میں یہ بات وزیراعظم لیاقت علی خاں [م: ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء]

تک پہنچاؤں گا'۔ بہر حال ڈیڑھ دو ماہ بعد ہوا یہ کہ حکومت نے ایک دوسرے فرد کو ہماری قیام گاہوں کا قبضہ لینے کی ہدایات جاری کیں۔ ابا جان نے کسی بحث میں الجھنے کی بجائے اسی روز سوہن لال کالج (اب مدرسۃ البنات لیک روڈ' چوبرجی) خالی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ' مغرب سے ذرا پہلے دو خالی تانگے لے کر آئے اور آتے ہی انھوں نے ہماری والدہ اور دادی اماں سے کہا: 'صرف وہ چیزیں اُٹھالیں، جو ہم لوگ دارالاسلام سے اپنے ساتھ لائے تھے اور بچوں کو لے کر فوراً باہر تانگوں میں بیٹھ جائیں'۔ اب نہ دادی اماں نے پوچھا اور نہ ہماری اماں جان نے سوال کیا کہ ہندستان سے ہجرت کر کے تو یہاں آ گئے' اب یہاں سے کدھر جانا ہے؟--- کیوں؟ کیا؟ اور کس لیے؟ اس قسم کے سوالات کرنے کا کلچر ہمارے گھر میں سرے سے تھا ہی نہیں۔ بس جو فیصلہ ابا جان نے کرلیا، وہ سب نے بے چون و چرا مان لیا۔ دونوں خواتین خاموشی سے اٹھیں اور اپنی وہی چیزیں سمیٹنے لگیں، جو دارالاسلام سے ہم ساتھ لائے تھے۔ چلتے وقت ہم بچوں نے کچھ کھلونے اٹھالیے، جو اس گھر میں پہلے سے پڑے ہوئے تھے' لیکن دادی اماں نے وہ کھلونے ہمارے ہاتھ سے چھین کر نیچے رکھ دیے اور کہا: 'تم نے اپنے ابا کو نہیں دیکھا کہ انھوں نے ہدایت کی ہے، یہاں سے کوئی چیز نہ اٹھائیں'۔

ہم باہر نکل کر تانگے میں بیٹھ گئے۔ ابا جان کے دوسرے رفقا بھی اسی طرح تانگوں میں بیٹھ رہے تھے۔ پھر یہ قافلہ اسلامیہ پارک پہنچا' جہاں آج کل ڈاکٹر ریاض قدیر مرحوم کی کوٹھی ہے۔ جماعت اسلامی کے کارکن خیمے لے کر وہاں پہنچ چکے تھے' کیمپ لگ چکا تھا۔ اس کیمپ میں ہم تقریباً ڈھائی ماہ تک قیام پذیر رہے۔ اس واقعے کے اگلے روز ابا جان نے مدرسۃ البنات والی جگہ کی چابیاں سرکاری اہل کاروں کے سپرد کر دیں۔

ابا جان نے کسی طرح کا ردعمل ظاہر کیے بغیر، جس شان بے نیازی و استغنا سے یہ کوٹھی خالی کر دی' وہ صرف انھی کے مقام اور مرتبے کا انسان کرسکتا تھا۔ ابا جان نے ایک جگہ لکھا ہے: 'ایمان چونکہ کوئی خارجی شے نہیں' بلکہ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے' اس لیے ایمان کی قیمت کوئی باہر کا خریدار نہیں مقرر کرسکتا' بلکہ خود صاحبِ ایمان ہی اس کی قیمت مقرر کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے نزدیک یہ اتنی حقیر شے ہو کہ وہ اسے روٹی کے ایک ٹکڑے کے عوض بے دریغ بیچ ڈالے

اور دوسرے کے نزدیک یہ اتنی متاعِ گراں بہا ہو کہ خدائے ارض وسما سے ورے کوئی گاہک اس کی نگاہوں میں جچے ہی نہیں' اور ... یہی وہ قوت ہے، جس سے مسلمان کے دل میں وہ بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کی ہوئی تہذیب وثقافت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ مسلمان سے جب دنیا کی ہر طاقت دبتی تھی تو یہ اس وقت تھا جب اس کی متاع ایمان کو کوئی خریدار کسی قیمت پر خرید نہیں سکتا تھا۔ مسلمان آج ہر قوم سے دبتا اور ڈرتا ہے یہ اس وقت ہے' جب کہ اس کے دل و دماغ سے متاعِ ایمان کی قدر و قیمت کم ہوگئی ہے'۔ اس وقت سے یہ بات ہمارے دماغوں میں راسخ ہوگئی ہے کہ عزت کا جھونپڑا' ذلت کے محل سے بہتر ہوتا ہے۔ بہر حال وہ مشکل وقت بھی گزر ہی گیا۔

انھی دنوں ابا جان نے اپنے رفقا کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے شہدا کی میتوں کو دفنایا جائے۔ اس فیصلے پر عمل درآمد کے لیے ٹرک کرائے پر لیے گئے اور جماعت اسلامی کے کارکن دو ٹیموں میں بٹ گئے۔ ایک ٹیم اس علاقے میں جہاں آج کل سمن آباد واقع ہے بڑی سی اجتماعی قبر کھودتی تھی اور دوسری ٹیم ٹرک پر لاشیں لاد کر لاتی تھی اور نماز جنازہ پڑھنے کے بعد ان کو اس اجتماعی قبر میں دفنا دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد پہلی ٹیم اگلی قبر کھودنے میں مصروف ہو جاتی تھی اور دوسری ٹیم لاشوں کی اگلی کھیپ لانے کے لیے روانہ ہو جاتی تھی۔ ہم بچے سارا دن وہاں کھڑے یہ منظر دیکھا کرتے تھے۔ کتنی ہی مرتبہ ہم کو وہاں سے یہ کہہ کر بھگایا جاتا تھا: 'بچے لاشیں نہیں دیکھا کرتے' رات کے وقت سوتے میں ڈرو گے' بھاگو یہاں سے'۔ لیکن ہم بچے تو دارالاسلام سے ہی اتنی لاشیں دیکھتے آ رہے تھے کہ ہمارا ڈر اور خوف ختم ہو چکا تھا اور اب ہم لاشیں دیکھ کر بالکل نہیں ڈرتے تھے۔ یاد رہے کہ یہ وہ قربانیاں ہیں، جن کی وجہ سے ہم کو پاکستان جیسی نعمت ملی' آج سمن آباد کے مکینوں کو شاید یہ معلوم بھی نہیں ہے کہ وہ تحریکِ پاکستان کے سیکڑوں شہیدوں کی قبروں پر رہتے اور چلتے پھرتے ہیں!

جب لاشیں دفنا دی گئیں تو پھر جماعت کے کارکنوں نے مہاجرین کے کیمپوں کا چارج سنبھالا۔ مگر اسی دوران سرکاری اہل کاروں اور بعض قومی رضا کاروں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ انھوں نے عطیے میں آئی رضائیوں' کمبلوں اور اشیائے خورد ونوش کو ہڑپ کرنا شروع کیا۔ وہ

لڑکیاں جو غیروں کی دست برد سے بچ کر، اپنے والدین کی شہادت یا ان سے بچھڑنے کے بعد بے آسرا ہو چکی تھیں، کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئی تھیں۔ یہ بتاتے ہوئے کتنا دکھ ہوتا ہے کہ ان پر بھی بعض پاکستانی قوم پرستوں نے ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ اس پر نہ صرف اخبارات میں خبریں چھپیں بلکہ کئی مظلوم لڑکیاں ابا جان کے پاس بھی یہ فریاد لے کر آئیں کہ: 'اگر پاکستان پہنچ کر بھی ہماری عزتیں محفوظ نہیں ہیں تو پھر ہم کہاں جائیں؟'

اسی دوران میں سکھوں سے بازیاب کی گئی لڑکیاں بھی کیمپوں میں پہنچنے لگیں۔ میرے نزدیک یہ اس دور کا دردناک ترین باب ہے۔ ان میں سے اکثر لڑکیاں زخموں سے چور تھیں۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک لڑکی کی آنکھ کسی سکھ نے کرپان کی نوک مار کر ضائع کر دی تھی۔ ایک لڑکی کا چہرہ اب بھی نظروں کے سامنے آتا ہے، جس کے رخسار پر بڑا سا گھاؤ تھا۔ بعض بچیوں کے جسموں پر دانتوں سے کاٹنے کے نشانات تھے۔ اس کے علاوہ ان کے سوختہ جان جسموں پر زخموں اور تشدد کے ایسے ایسے نقوش تھے، کہ قلم انھیں بیان کرنے کی تاب نہیں رکھتا۔ ان بچیوں نے یہ سب مظالم پاکستان اور اس کے مستقبل کے لیے برداشت کیے تھے۔ یہ تو وہ زخم تھے، جو ان کے جسموں پر تھے، مگر وہ زخم جو ان کے دلوں اور روحوں کو لگے تھے، وہ ظاہری زخموں سے کہیں زیادہ گہرے اور کہیں زیادہ کرب انگیز تھے۔

انھوں نے رو رو کر بتایا کہ 'ہمیں دشمن زبردستی شرابیں پلاتے اور اپنے سامنے ناچنے پر مجبور کرتے تھے۔ جو کچھ ان پر گزری، اسے بیان کرنے کے لیے وہ لڑکیاں بے تاب تھیں۔ ہم گھر میں دادی اماں اور اماں جان کے پاس بیٹھے ہوتے تو وہ یہ خیال کیے بغیر کہ ہم جیسی نوعمر بچیاں بھی بیٹھی ہوئی ہیں، سب کچھ بتانے لگتی تھیں۔ اپنے بدن کھول کر، کپڑے ہٹا ہٹا کر زخم دکھانے لگتیں۔ جب اماں جان غم کی شدت اور حیا کی حدت کے ساتھ انھیں فرداً فرداً سمجھاتیں کہ 'بیٹی' اس طرح کی باتیں نہ بتاؤ اور اس طرح کپڑے ہٹا کر اپنے زخم نہ دکھاؤ۔ تو وہ رو رو کر کہتیں کہ 'اب باقی رہ ہی کیا گیا ہے، جس کی حفاظت کے لیے ہم شرم و حیا کے ان لفظوں کا لحاظ کریں؟'

چونکہ یہ باتیں دادی اماں، اماں جان اور ابا جان کے براہِ راست علم میں آتی تھیں، اس لیے ان کے گہرے اثرات سے ہمارے گھر کی حالت سوگوار اور فضا بوجھل دکھائی دیتی تھی۔

اماں جان کی آنکھوں میں آنسوؤں اور ابا جان کے چہرے پر غصے' غیرت اور بے بسی کے رنگ دیکھ کر ہم سہم جاتے تھے۔

ایسی ہی ایک بازیافتہ خاتون سے تو اب بھی اکثر ملنا ہوتا ہے۔ ان کے بیٹے اس وقت بڑے بڑے عہدوں پر ملازم ہیں اور گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے' لیکن ان پر آئے دن افسردگی (depression) کے دورے پڑتے ہیں' خصوصاً اگست کے مہینے میں! گذشتہ ۱۴ اگست کو فون کر کے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگیں: 'ساری زندگی ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی میں رہتے گزر گئی ہے' لیکن جب بھی خواب دیکھتی ہوں تو وہی لدھیانے والا گھر نظر آتا ہے۔ گھر کو آگ لگی ہوئی ہے' باپ کی لاش صحن میں پڑی ہے' پہلے بڑی بہن کو سکھ گھسیٹ کر لے جا رہے ہیں' اس کے بعد ایک سکھ نے' جسے ہم چاچا جی کہتے تھے' مجھ پر ہاتھ ڈالا اور میں دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میری بڑی بہن اجتماعی آبروریزی کا شکار ہو کر دم توڑ گئی۔ میں بے غیرت تھی کہ مجھے موت بھی نہ آئی۔ اب ہر سال ۱۴ اگست کو اس قدر روشنیاں ہوتی ہیں اور اس قدر ترانے گائے جاتے ہیں کہ اس سارے عمل نے 'سوہنی دھرتی' کو قدم قدم برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ جوان لڑکے جن کا فرض اپنے وطن کا دفاع کرنا ہے' کندھوں پر لمبے لمبے بال پھیلائے کمر لچکا لچکا کر گانے اور ناچنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور یہ سب کچھ آزادی کے نام پر ہو رہا ہے۔ اس آزادی کی جو قیمت ہم نے ادا کی ہے وہ ہم سے پوچھو۔ 'وطن کی مٹی گواہ رہنا' گانے والیاں کیا جانیں کہ اجتماعی بے حرمتی کا شکار ہونے والیوں پر کیا گزری! تم یقین کرو کہ پاکستانیوں کو آزادی راس نہیں آئی ہے۔ جن سے اب یہ دوستی کی پینگیں بڑھا رہے ہیں' انھیں معلوم نہیں ہے کہ ہم بھی ان کو کبھی بھاپا جی' ماما جی اور چاچا جی کہتے تھے!'

پھر خاتون کہنے لگیں: 'یقین جانو ۱۴ اگست کے جشن کی روشنیاں ہمارے 'اندر' کے اندھیروں کو اور بھی بڑھا دیتی ہیں۔ میری بہن، جس کا آنچل بھی کبھی کسی غیر محرم نے نہیں دیکھا تھا' وہ اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنی اور اب ایسا لگتا ہے کہ شاید ہم نے یہ قربانیاں دی ہی کنجروں اور میراثیوں کے لیے تھیں' تاکہ وہ یہاں مٹک مٹک کر ناچیں اور گائیں۔ مجھے بتاؤ کیا پاکستان اسی لیے بنایا گیا تھا؟'

ان خاتون کی باتوں کا میرے پاس کوئی بھی جواب نہ تھا۔ وہ تو اپنا غصہ نکال رہی تھیں۔ گھر والے لدھیانے کا نام سنتے ہی ناراض ہو جاتے تھے اور جو کچھ ان کی والدہ پر اور خالہ پر گزری‘ اس کا ذکر تک سننے کو تیار نہیں تھے۔ غضب یہ ہے کہ جب کبھی میں ان سے ملنے ان کے گھر جاتی ہوں تو ان کے پوتے پوتیاں مجھے دیکھتے ہی ’لدھیانہ زندہ باد!‘ کا نعرہ لگاتے ہیں۔

ان بے خانماں اور تباہ حال لڑکیوں کے لواحقین کو تلاش کرنا اور ان کے دُور ونزدیک کے رشتے داروں کا سراغ لگانا ایک بڑا مشکل کام تھا۔ ذرا سوچیے‘ خود وہ لمحے کتنے دردناک ہوتے ہوں گے‘ جب لواحقین مل جانے کے باوجود اپنی بہن‘ بیٹی کو پہچاننے یا ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتے تھے۔ تب ان لڑکیوں کے منہ سے اپنے بھائی‘ باپ اور خاندان والوں کے لیے بددعاؤں اور گالیوں کی بوچھاڑ اور دل دہلا دینے والی چیخ پکار نکلتی تھی‘ جسے سن کر دہشت سے کلیجہ کانپ اٹھتا تھا۔ ابا جان اور ان کے ساتھیوں نے ایسی متعدد لڑکیوں کے نکاح کا بندوبست کیا تھا۔

ان امدادی کاموں کے ساتھ ساتھ‘ ابا جان نے قرارداد مقاصد پاس کرانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ پورے ملک کا طوفانی دورہ کیا‘ ریڈیو پاکستان سے تقریریں کیں اور پنجاب یونی ورسٹی لا کالج میں اسلامی قانون پر لیکچر دیے۔ انتظامی اہل کاروں کی بے حسی‘ کیمپوں میں متعدد رضا کاروں کا بے دردانہ طرزِ عمل اور متروکہ املاک کو ہڑپ کرنے کی منظّم کوششوں کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ ان تمام کاوشوں نے حکومت کی نظر میں ابا جان اور جماعت اسلامی کو اپنا دشمن نمبر ایک بنا دیا۔ وزیراعظم‘ نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم اپنے اقتدار کے حوالے سے اور سیکولر عناصر اپنے لادینی نظریات کے حوالے سے‘ اس ہمہ پہلو جدوجہد سے بہت زِچ ہوئے۔ یوں حکومت نے جوابی طور پر پروپیگنڈا مہم شروع کی۔ بے بنیاد الزامات لگا کر‘ جماعت کے کام کے راستے بند کرنا شروع کیے۔ نواب صاحب نے اخبار نویسوں سے کہا: ’مولانا مودودی‘ پاکستان کے امیر المومنین بننا چاہتے ہیں‘۔ حالانکہ وہ تو مہاجروں سے زیادتی کے خاتمے‘ امن کی بحالی‘ لوٹ کھسوٹ سے اجتناب اور خود اہلِ پاکستان سے کیے جانے والے وعدے یاد دلا رہے تھے۔

ابا جان نے اس زمانے میں برملا کہا: اگر اسلامی ریاست کے حوالے سے‘ پاکستان کی

سیاسی قیادت اور دستور ساز اسمبلی نے پاکستان کا مطلب کیا؟ لآ الٰہ الا اللّٰہ کو باقاعدہ طور پر ریاست کے عقیدے اور نصب العین کے طور پر تسلیم کرنے کا اعلان نہ کیا تو یہ اسلامیانِ پاک کے ساتھ تاریخ کا سب سے بڑا دھوکا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے قراردادِ مقاصد کا تصور دیا، جس میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت (ساورنٹی) تسلیم کرنے اور عوام کو عدلِ اجتماعی دلوانے کا لائحہ عمل پیش کیا گیا تھا۔ اس تصور کو قرارداد کی شکل میں تسلیم کرانے کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ [م: ۱۳ دسمبر ۱۹۴۹] نے بھرپور آواز بلند کی، مولانا ظفر احمد انصاریؒ [م: ۲۰ دسمبر ۱۹۹۱] مولانا عثمانیؒ کے معاون تھے۔ خود مسلم لیگ کے بہت سے ارکان اسمبلی نے قرارداد کی تائید کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا۔ قراردادِ مقاصد کو تسلیم کرانے کے لیے بھرپور جدوجہد کرنا، ابا جان کا ایک نمایاں ترین کارنامہ ہے۔ جب پاکستان میں اشتراکیت کی آندھی چلنے کے آثار پیدا ہوئے تو انھوں نے اعلان کیا: 'یہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا ملک ہے، یہ کارل مارکس [م: ۱۸۸۳ء] اور ماوزے تنگ [م: ۱۹۷۶ء] کی قوم کا ملک نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے ہمیں لڑنا پڑا تو ہم خدا کے فضل سے دس محاذوں پر بھی لڑنے سے نہ چوکیں گے۔ ہم بیک وقت آمریت کا بھی مقابلہ کریں گے اور بے دینی سے بھی لڑیں گے۔ جب تک ہم زندہ ہیں اور جب تک ہمارے سر ہماری گردنوں پر قائم ہیں، اس وقت تک کسی کی ہمت نہیں کہ وہ یہاں اسلام کے سوا کوئی نظام لا سکے۔

شجر سایہ دار

بعض لوگ اپنی ذات میں انجمن ہوتے ہیں اور بعض ایسے شجر ثمر دار کے مانند، جن کے سائے میں اپنے پرائے، امیر غریب، بچے بوڑھے، سب پناہ لیتے ہیں اور ان کا پھل کھاتے ہیں۔ ان کی چھاؤں سب کے لیے ہوتی ہے، اور وہ اپنی چھاؤں اور اپنے پھل سے کسی کو بھی محروم نہیں کرتے۔ ہماری اماں جان (بیگم مودودیؒ) بالکل ایسی ہی تھیں۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھیں! انھوں نے باپ اور ماں بن کر ہم نو بہن بھائیوں کو اپنے سائے میں پروان چڑھایا۔

ہمارے والد محترم (سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ) کے حوالے سے ہمارا گھر ہر وقت لوگوں سے بھرا رہتا تھا، باہر مرد حضرات اور اندر خواتین۔ ہم نے بچپن ہی سے اپنے گھر میں 'جمعہ' ہوتا

دیکھا تھا۔ ۱۱ بجے سے گھر کے سب سے بڑے کمرے میں دری' چاندنی کا فرش بچھ جاتا تھا اور ہماری اماں جان صلوٰۃ التسبیح پڑھنے میں مشغول ہو جاتی تھیں۔ چونکہ یہ انفرادی عبادت ہے' اس لیے ہمارے گھر میں صلوٰۃ التسبیح کبھی باجماعت نہیں ہوئی۔ اسی اثنا میں دُور ونزدیک سے خواتین کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔ جب جمعے کی نماز کا وقت ہو جاتا تو کمرہ خواتین سے تقریباً بھر چکا ہوتا۔ ہماری اماں جان نماز باجماعت پڑھاتیں۔ نماز کے بعد بہت لمبی اجتماعی دعا ہوتی تھی' اس کے بعد درس قرآن وحدیث۔ درس کے بعد دوبارہ دعا ہوتی، جس کے بعد یہ اجتماع منتشر ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ہمارے گھر میں عیدین کی نمازوں کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ ہماری اماں جان فجر کی نماز کے بعد تلبیہ پڑھتی اور عید کی نماز کے لیے تیاری کرواتی تھیں۔ ابھی ہم دری' چاندنی کا فرش بچھا کر فارغ بھی نہیں ہوتے تھے کہ نماز عید کے لیے خواتین کی آمد شروع ہو جاتی تھی' جو صفیں باندھ کر بیٹھتی جاتی تھیں' پھر سب مل کر تلبیہ پڑھتے تھے۔ سورج نکلتے ہی خواتین کو تکبیروں کے بارے میں ہدایات دی جاتی تھیں اور پھر اماں جان بڑی خوش الحانی سے سب کو نماز پڑھاتی تھیں۔ نماز کے بعد خطبہ ہوتا تھا۔ دعا کے بعد سب کو سویاں کھلائی جاتی تھیں اور عید کی مبارک باد دیتی تھیں۔

ابّا جان کی پہلی گرفتاری

جیسے ہی ذہن ماضی کی طرف لوٹتا ہے تو چشم تصور میں ایک منظر گھوم جاتا ہے۔

رات کا وقت ہے اور اماں جان' ہم چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے ساتھ لگائے کھڑی ہیں۔ دو لیڈی کانسٹبل آگے بڑھتی ہیں۔ وہ اماں جان اور پورے گھر کی تلاشی لے رہی ہیں۔ ابا جان کے کپڑے ایک سوٹ کیس میں رکھے ہیں اور وہ تیار ہو کر کہیں جانے کو کھڑے ہیں۔ پھر یک دم ابا جان پیچھے مڑ کر ہماری طرف دیکھے بغیر قدرے بلند آواز میں 'السلام علیکم' خدا حافظ' فی امان اللہ' کہتے ہیں اور پولیس والوں کے ساتھ روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہ پہلی گرفتاری تھی، جو ۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ہوئی۔ اس وقت میری عمر آٹھ سال تھی۔ بعد میں' میں نے اماں جان سے پوچھا: 'ابا جان نے جاتے وقت ہماری طرف مڑ کر دیکھا کیوں نہیں تھا؟' اماں جان نے بڑے اطمینان سے کہا: 'حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو مکے سے جاتے وقت حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے ارادے اور عزم میں کمزوری آجاتی

ہے۔ اماں جان ہمیں انبیا علیہم السلام کے قصے سناتی رہتی تھیں، اس لیے بات سمجھنے کے لیے اتنا اشارا ہی کافی تھا۔

جب ابا جان گرفتار ہوئے تو اس وقت گھر میں بہت تھوڑے سے پیسے تھے۔ اس لیے ہماری اماں جان نے زندگی کے تمام معمولات بدل دیے۔ دھوبی کو کپڑے دینے بند کر کے انھوں نے خود کپڑے دھونے شروع کر دیے، حالاں کہ ان کا تعلق دہلی کے ایسے متمول گھرانے سے تھا جہاں بلا مبالغہ ایک رومال بھی خود نہیں دھویا جاتا تھا۔ ملازم کو فارغ کر کے کھانا خود پکانا شروع کر دیا۔ ان دنوں ایک مائی جو اچھرہ سے جمعہ پڑھنے ہمارے ہاں آیا کرتی تھی اور ایک تانگے والے کی بیوہ بہن تھی، وہ اصرار کر کے ہمارے ہاں آ گئی اور سارے کام سنبھال لیے، کپڑے دھونے شروع کر دیے اور آٹا گوندھ کر تنور سے روٹیاں لگوا کر لے آتی۔ اس نے اماں جان سے کہا: 'آپ اللہ تعالیٰ کے کام کریں، آپ کے گھر کے کام میں کروں گی'۔ اس کا نام 'بھاگ بھری' (قسمت والی) تھا۔ یہ نام چونکہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا، اس لیے ہم سب اسے 'رس بھری' کہتے تھے، جس کا اس نے کبھی برا نہیں مانا تھا۔

ہماری اماں جان ہر وقت **یَاحیّ یَا قیّوم بِرَحمَتِکَ استغیث** کا ورد کرتی رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ دمے کا بہت شدید دورہ پڑا تو تکلیف کی شدت میں بس اتنا کہا: 'میرے میاں جیل میں ہیں، مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بچے روئیں گے اور انھیں کوئی چپ کرانے والا بھی نہیں ہوگا'۔ ہماری دادی اماں یہ سن کر سخت ناراض ہوئیں: 'کیوں مایوسی کی باتیں کرتی ہو، حوصلہ کرو، کیا ہوا جو ذرا سا سانس اوپر نیچے ہو گیا'۔

ہماری دادی اماں بڑی حوصلے والی خاتون تھیں۔ وہ ہماری اماں جان کو نصیحت کیا کرتی تھیں: 'بچوں کو ایسی عادت ڈالو کہ سرد و گرم ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ ایک وقت سونے کا نوالا کھلاؤ، موتی کوٹ کر کھلاؤ، لیکن دوسرے وقت دال سے روٹی کھلاؤ، چٹنی سے روٹی کھلاؤ۔ بچوں کو کبھی ایک طرح کی عادت نہ ڈالو اور نہ ہر وقت ان کی منہ مانگی مراد پوری کرو۔ ماں باپ تو آسانی سے اولاد کی عادتیں خراب کر دیتے ہیں، لیکن دنیا کوئی لحاظ نہیں کرتی۔ یہ تو بڑے بڑوں کو سیدھا کر دیتی ہے'، اور پھر کہتی تھیں: 'میں نے اپنے بچوں کو اسی طرح پالا ہے۔ ایک وقت اچھے

سے اچھا کھلایا تو دوسرے وقت دال چٹنی سے روٹی کھلائی'۔

شاید یہی وجہ تھی کہ ہمارے ابا جان ہر طرح کے سرد و گرم حالات سے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ گزر گئے اور ہر سختی اپنی جان پر جھیل گئے۔ ان کے اعصاب فولاد کے بنے ہوئے تھے۔ وہ اپنا ٹوٹا ہوا بٹن خود ٹانک لیتے تھے۔ اپنا پھٹا ہوا کرتہ خود رفو کر لیتے تھے۔ ان کی 'جیل کٹ' (jail kit) جو پہلی گرفتاری کے بعد ہر وقت تیار رہتی تھی' اس میں سوئی دھاگا اور ہر سائز کے بٹن بھی ہوا کرتے تھے۔

ہماری دادی اماں ولی اللہ تھیں۔ وہ جب بیمار ہوتی تھیں تو آسمان کی طرف نظریں اُٹھا کر بڑے جذبے کے ساتھ دعا اور التجا کرتے ہوئے کہتی تھیں: **من مریضم تو طبیبم**۔ اور پھر وہ ٹھیک ہو جاتی تھیں۔ زندگی بھر ڈاکٹر کو نہیں دکھایا اور نہ کبھی دوا پی۔ اگر کبھی پھوڑا پھنسی نکل آتا تو اس جگہ ہاتھ رکھ کر کہتی تھیں: 'اے دنبل' بزرگ مشو' خدائے ما بزرگ تر است' [اے پھوڑے زیادہ نہ بڑھ' ہمارا خدا سب سے بڑا ہے]۔ یہ کہنے سے وہ پھوڑا ٹھیک ہو جاتا تھا۔ وہ فارسی زبان و ادب کی اسکالر تھیں اور اکثر بات کا جواب فارسی اشعار میں دیا کرتی تھیں۔

دادی اماں جس محفل میں بھی بیٹھتی تھیں' خواہ وہ کتنی ہی بڑی محفل ہوتی' ان کے ہوتے ہوئے کوئی دوسری خاتون بول نہیں سکتی تھی۔ بس' سب ان کی باتیں سنتے تھے اور انھی کو دیکھتے تھے۔ وہ ہر محفل کی جان ہوتی تھیں۔ گفتگو اس قدر ادبی اور دل چسپ کرتی تھیں کہ کوئی اگر ایک بار ان سے مل لیتا تھا' تو ان کو اور ان کی باتوں کو کبھی بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ غضب کی حاضر جواب تھیں۔ ایسی برجستہ بات کہتی تھیں کہ سننے والوں کے دل پر وہ بات نقش ہو جاتی تھی۔ ایسی خوش گفتار اور بذلہ سنج خاتون تھیں کہ سب کو ہنساتی تھیں' لیکن خود سنجیدہ رہتی تھیں۔ اس پر ہم لوگوں کو اور زیادہ ہنسی آتی تھی کہ خود کیسے سوکھا سا منہ بنائے رکھتی ہیں اور ہمیں ہنسا ہنسا کر برا حال کر دیتی ہیں۔

ہمارے ماموں جلال کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے ایک روز دادی اماں سے شرط لگا دی کہ ہم دونوں نثر میں نہیں بلکہ شعر میں بات کریں گے۔ اب دادی اماں کو تو کسی سے مدد لینے کی ضرورت نہ پڑی' لیکن ماموں بار بار ہماری اماں جان کے پاس شعر پوچھنے کے لیے آنے لگے' یا یہ کہتے: 'ایک مصرع یاد ہے' خطرہ ہے کہ آدھے شعر پر دادی اماں

ہر گز نہ بخشیں گی اور نہ غلط شعر پڑھنے پر ہی معاف کریں گی'۔ مشکل یہ آن پڑی کہ اگر اماں جان' ہمارے ماموں کی مدد کرتیں تو یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہوتی۔ چنانچہ اماں جان نے دادی اماں سے اجازت مانگی: 'کیا میں جلال میاں کی کچھ مدد کر دوں؟' دادی اماں نے بخوشی اجازت دے دی: 'بچہ ہے' اگر رہنمائی چاہتا ہے تو کوئی بات نہیں'۔ لیکن اس کے باوجود ایک ہفتے کے اندر اندر جلال ماموں شرط ہار گئے اور اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہنے لگے' دادی اماں سے آیندہ ایسی شرط نہیں لگاؤں گا۔

ہماری اماں جان کہتی تھیں: 'میں نے اپنی پوری زندگی میں تمھاری دادی اماں جیسی کوئی دوسری عورت نہیں دیکھی کہ جس میں سرے سے 'نفس' ہی نہ ہو'۔ انھیں کسی چیز کی طلب ہی نہیں تھی۔ دادی اماں کہا کرتی تھیں: 'صوفیا کی صفت یہ ہے کہ وہ کسی کو منع نہیں کرتے' طمع نہیں کرتے اور جمع نہیں کرتے'۔ اتفاق سے یہ تینوں صفات ہماری دادی اماں' ابا جان اور اماں جان میں موجود تھیں۔ رضا بہ قضا اور صبر جیسی اعلیٰ صفات کی ان تینوں ہستیوں نے اپنے اندر اس طرح سے پرورش کی تھی کہ وہ نفس مطمئنہ کا بہترین نمونہ بن گئے تھے۔

اماں جان یہ ذکر کیا کرتی تھیں کہ میں نے جینے کا سلیقہ تمھاری دادی اماں سے سیکھا ہے'۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ساس بہو' دونوں ہمیشہ ایک رائے رکھتی تھیں اور کبھی آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا تھا۔

جب ابا جان پہلی مرتبہ جیل گئے اور ہاتھ بالکل تنگ ہو گیا تو اماں جان نے فیصلہ کیا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے بچوں کی تعلیم جاری رہنی چاہیے۔ ہماری اماں جان کی ایک نہایت مخلص دوست خورشید خالہ' جب ان سے ملنے آئیں تو اماں جان نے اپنا کچھ زیور انھیں دیا کہ' اسے فروخت کرلائیں'۔ اس طرح وہ بچوں کی تعلیم اور گھر کے اخراجات بڑی جزرسی کے ساتھ اور بہت سنبھل کر پورے کرتی تھیں۔

عید بقرعید یا رشتے داروں کے گھر شادی بیاہ پر نئے کپڑے بنوانے کا رواج ہمارے گھر میں بالکل نہیں تھا۔ ہماری اماں جان نے ہمیں سمجھا دیا تھا: 'رمضان میں چونکہ زکوٰۃ ادا کرنی ہوتی ہے' اس لیے عیدالفطر پر نئے کپڑے نہیں بنائے جا سکتے اور بقرعید پر قربانی دینی ہوتی ہے' اس

لیے نئے کپڑوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس لیے دھوبی کے دھلے ہوئے کپڑے پہنو اور عید کی نماز پڑھنے چلے جاؤ'۔ اسی طرح ہر شادی میں نئے کپڑوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج کل' جب اس طرح کی خبریں اخبار میں نظر سے گزرتی ہیں کہ ایک ماں نے خود کو آگ لگا کر خودکشی کر لی کیوں کہ اس کے بچوں کے لیے عید کے نئے کپڑوں کا انتظام نہیں ہو سکا تھا' یا باپ نے خود کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا لیا کہ وہ عید پر بچوں کی فرمائشیں پوری نہیں کر سکتا تھا، تو بہت حیرت ہوتی ہے۔

ایک بار گھر میں آٹا ختم ہو گیا۔ شام کا وقت تھا اور آٹا پیسنے کی چکی بھی بند ہو چکی تھی۔ ہماری ملازمہ کریم بی بی' ہمسایے گھر سے' عاریتاً آٹا مانگ کر لے آئیں۔ یہ دیکھ کر اماں جان سخت خفا ہوئیں: 'تو نے یہ کیا کیا؟' کریم بی بی کہنے لگی: 'بی بی جی' وہ بھی کئی بار ہم سے آٹا مانگ لیتے ہیں اور جب ان کا آٹا پس کر آ جاتا ہے تو وہ واپس دے جاتے ہیں۔ کل جب ہمارا آٹا پس کر آ جائے گا تو میں بھی انھیں واپس دے آؤں گی'۔ لیکن اماں جان نے کہا: 'ان کی بات اور ہے۔ وہ جتنا چاہیں دوسروں سے ادھار آٹا لیں' مگر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ لوگ کہیں گے کہ مولانا صاحب جیل میں ہیں اور ان کے گھر والے ہمسایوں سے مانگ مانگ کر کھا رہے ہیں۔ اگر گھر پہ آٹا نہیں تھا تو ہم کسی بھی طرح گزارا کر لیتے' کھچڑی پکا لیتے' روکھی سوکھی کھا لیتے' مگر تمھیں یوں ادھار مانگنے نہیں جانا چاہیے تھا'۔ ان کی ایسی سرزنش کی گئی کہ پھر دوبارہ ان سے یہ خطا نہ ہوئی۔

اماں جان کہا کرتی تھیں: 'دنیا میں ہر چیز کے بغیر گزارا ہو سکتا ہے' بلکہ گزارا ہوتا نہیں 'کیا' جاتا ہے'۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی مدد سے وہ مشکل وقت بھی گزر ہی گیا اور ۲۸ مئی ۱۹۵۰ء کو ۱۹ ماہ اور ۲۵ دن کی نظر بندی کے بعد ابا جان پھولوں کے ہاروں سے لدے پھندے گھر آ گئے اور سارا گھر مبارک باد دینے والوں سے بھر گیا۔

ابّا جان کی دوسری گرفتاری اور سزائے موت

۲۸ مارچ ۱۹۵۳ء کو ابا جان دوبارہ مارشل لا کے تحت گرفتار کر لیے گئے۔ پھر وہی گنے چنے پیسے تھے اور چھوٹے چھوٹے آٹھ بچوں کے ساتھ دمے کی مریضہ' انتہائی کمزور صحت والی ہماری اماں جان تھیں' جنھوں نے بڑے حوصلے سے ان حالات کا مقابلہ کیا۔ کبھی چوڑی اور کبھی

انگوٹھی بیچنے کا سلسلہ جاری رہا (یہ کام خورشید خالہ مرحومہ انجام دیتی تھیں) حسب سابق پھر خود کھانا پکانا اور گھر کے سارے کام کرنے شروع کر دیے۔ اس مرتبہ مارشل لا کے تحت فوجی عدالت میں ابا جان پر مقدمہ چل رہا تھا۔ یہ مقدمہ ایک پمفلٹ **قادیانی مسئلہ** لکھنے کے سلسلے میں چل رہا تھا۔ ۹ مئی ۱۹۵۳ء کو مقدمے کی کارروائی مکمل ہوگئی۔

یہ ۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کی صبح تھی، جب اماں جان ناشتا بنا رہی تھیں اور ہم سب بچے اسکول جانے کے لیے تیار ہوکر ناشتے کے انتظار میں بیٹھے تھے، اسی دوران میں یکدم ہمارے سب سے بڑے بھائی عمر فاروق صاحب [پ: ۱۲ اپریل ۱۹۳۸ء، دہلی] ہاتھ میں اخبار لیے بڑے گھبرائے ہوئے اندر آئے اور اماں جان کو ایک طرف لے جا کر اخبار دکھایا۔ اس اخبار میں نہ جانے کیا تھا کہ اسے دیکھتے ہی اماں جان کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ تاہم دوسرے ہی لمحے انھوں نے اخبار چھپا دیا اور ایک لفظ کہے بغیر، ہمارے لیے اسی دل جمعی اور اسی رفتار سے پراٹھے بنانے شروع کر دیے، جیسے وہ پہلے بنا رہی تھیں۔ پھر ہم سب کو ناشتا کروا کر اسکول روانہ کر دیا اور اندر جا کر آ کا بھائی [سید عمر فاروق] کو بھی اسکول جانے کی ہدایت کی۔ اندر سے عمر بھائی کی آواز آئی: 'نہیں اماں، مجھ سے اسکول نہیں جایا جائے گا'۔ دوسرے بڑے بھائی احمد فاروق [پ: ۱۱ مئی ۱۹۳۹ء، دہلی] گھر سے کچھ دُور ہی گئے تھے کہ ایک ہاکر زور زور سے اعلان کر رہا تھا: 'مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی'۔ وہ تو اپنا اخبار بیچنے کے لیے آواز لگا رہا تھا، لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے سامنے سے جو ایک بچہ یونی فارم پہنے سائیکل پر سوار اپنے اسکول جا رہا ہے، یہ اسی کے باپ کو پھانسی دینے کا اعلان ہے۔ چنانچہ احمد فاروق بھائی بھی آدھے راستے ہی سے واپس آ گئے۔

میں اور اسما [پ: ۲۳ دسمبر ۱۹۴۱ء، دہلی] جب اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلے، تو ہاکروں کی صدائیں کان میں پڑیں: 'مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی'۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ عمر بھائی اخبار ہاتھ میں لیے کیوں گھبرائے ہوئے اماں جان کے پاس آئے تھے اور اس اخبار میں کیا تھا، جسے دیکھتے ہی اماں جان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ہم دونوں بہنیں گھر واپس نہیں آئیں، بلکہ سیدھی اسکول چلی گئیں۔

ہم ۶۰ فیروز پور روڈ والے سرکاری اسکول میں پڑھتے اور گھر سے پیدل جاتے تھے۔

اسکول میں ہمیں جو بھی دیکھتا' حیران رہ جاتا تھا۔ ہماری ہیڈ مسٹریس صاحبہ ایک عیسائی خاتون تھیں۔ انھوں نے جب اسکول اسمبلی میں ہمیں دیکھا تو تقریر کرتے ہوئے طالبات سے کہا: 'دیکھو، رہنما ایسے ہوتے ہیں کہ باپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے اور بیٹیاں صاف ستھرے یونی فارم پہنے اسمبلی میں بالکل پُرسکون کھڑی ہیں۔ شاباش اس ماں کو ہے، جس نے ایسے دن اور ایسے موقعے پر بھی اپنی بچیوں کو صاف کپڑے پہنا کر' بال بنا کر' کھلا پلا کر اسکول روانہ کر دیا۔ یہ لڑکیوں کا کمال نہیں ہے' یہ تو ان کی ماں کی عظمت ہے کہ انھوں نے آج بھی اپنی بچیوں کی تعلیم کو مقدم جانا۔ کوئی اور جاہل عورت ہوتی تو اس نے رو رو کر اور بین کر کر کے سارا محلّہ سر پر اٹھالیا ہوتا'۔ ہیڈ مسٹریس صاحبہ نے یہ بھی کہا: 'عام لوگوں اور لیڈروں میں یہی فرق ہوتا ہے'۔ اس وقت میں نویں جماعت میں تھی اور اسما ساتویں جماعت میں پڑھتی تھی۔

وہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ تو عیسائی تھیں اور ایسی باتیں کر رہی تھیں' جب کہ ہماری دوسری اسکول ٹیچرز جو مسلمان تھیں' کہہ رہی تھیں: 'یہ کہاں سے لیڈر بن گئے یہ تو غدّار ہیں' پاکستان کی مخالفت کرنے والے۔ لڑکیاں بھی دیکھو کتنی مکار ہیں' یہ سب ایکٹنگ ہے' چالاک ماں کی چالاک لڑکیاں!'

اسکول سے واپس جب ہم اپنے گھر ۵-اے' ذیلدار پارک آئے تو منظر ہی اور تھا۔ پوری گلی لوگوں سے بھری پڑی تھی۔ دُور دُور تک بسیں کھڑی تھیں، جن میں سوار ہو کر لوگ دوسرے شہروں سے آ گئے تھے' ہم دونوں بہنیں گلی سے گزر کر گھر کے دروازے تک بمشکل پہنچ سکے۔ پھر دروازے سے گھر کے اندر داخل ہونا مشکل تر ہو گیا۔ کچھ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور کچھ خاموشی سے آنسو بہا رہے تھے۔ ایسے میں جب انھوں نے ہمیں خاموشی سے بستے اٹھائے اسکول سے گھر آتے دیکھا تو حیران رہ گئے۔ انھوں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور کہا: جب مولانا کے بچے نہیں رو رہے اور صبر وسکون کے ساتھ حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں تو ہم روتے اور بے صبرے ہوتے کیا اچھے لگتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا: 'صبر تو اسی کو کہتے ہیں'۔ بڑی مشکل سے ہجوم میں سے گزر کر جب ہم گھر کے اندر پہنچے تو پورا گھر خواتین سے پٹا پڑا تھا۔ جو خواتین اس دن ہمارے گھر اظہار ہمدردی کے لیے آئی تھیں' رو رہی تھیں۔ اماں جان ان کو صبر کی تلقین کر رہی تھیں اور یہی حال ہماری دادی اماں کا بھی تھا۔ جب ہمیں دیکھا تو اماں جان نے بس اتنا کہا: 'بیٹا' گھبرانا

نہیں، صبر کرنا اور پھر ہم سب کو اپنے ہاتھ سے پکایا ہوا کھانا کھلایا اور جا کر خواتین میں بیٹھ گئیں۔

اس روز ایک خاتون نے اماں جان سے کہا تھا: 'بیگم صاحبہ' آج رات آپ ۱۰۰ نفل حاجت کے لیے پڑھیں اور پھر تہجد کے نفل پڑھ کر مولانا صاحب کی زندگی، سلامتی اور بقا کے لیے دعا کر کے یہ منت مانیں کہ جب سلامتی اور خیر و عافیت سے گھر واپس آئیں گے تو پھر میں اسی طرح ۱۰۰ نفل شکرانے کے ادا کروں گی'۔ غرض وہ ساری رات اماں جان نے نفل پڑھتے ہوئے گزاری۔ رات کو میں نے جب بھی دیکھا (ایسی ہولناک رات میں بھلا نیند کسے آنی تھی) انھیں نفل پڑھتے ہوئے پایا۔

فجر کی اذان سنتے ہی ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ فجر کی نماز کے بعد اماں جان نے تلاوت کے لیے قرآن کھولا اور وہی سلسلہ جہاں سے روز پڑھتی تھیں، پڑھنا شروع کیا۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ سورۃ البقرہ کی، جو آیت ان کے سامنے آئی وہ یہ تھی:

> اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○ (البقرہ:۲۱۴)
>
> پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی تمھیں جنت میں داخلہ مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے، جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں وہ ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انھیں تسلی دی گئی کہ ہاں، اللہ کی مدد قریب ہے۔

اس آیت کو اماں جان پڑھتی گئیں اور روتی گئیں۔ پھر مجھے بلایا اور یہ آیت دکھائی، کہنے لگیں: دیکھو، یہ زندہ کتاب ہے، یہ انسان کی دکھتی رگ پکڑتی ہے۔ یہ دل کا چور پکڑتی ہے۔ یہ دکھی انسان کے زخموں پر مرہم رکھتی ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ تم اس سے دوستی کر لو! پھر یہ تمھارے حالات کے مطابق، تمھاری دلی کیفیت کے مطابق تم سے معاملہ کرے گی، تمھیں مشورہ دے گی اور تمھیں تسلی دے گی۔ اب دیکھو عین ہمارے حالات اور ہماری دلی کیفیت کے مطابق ہمیں کیسے تسلی دے رہی ہے، کیسے ہمارے زخموں پر مرہم رکھ رہی ہے!

اگر چہ اس وقت میری عمر ۱۳ برس تھی، لیکن شاید سب سے بڑی بیٹی ایک طرح سے والدہ کی چھوٹی بہن یا سہیلی کے مانند ہوتی ہے۔ اس لیے اماں جان اکثر دل کی باتیں مجھ سے کرتی تھیں۔ مشورہ بھی مجھ ہی سے لیتی تھیں اور میں ان کی رازدار تھی۔ مجھ پر انھیں بڑا بھروسا تھا۔ لیکن پھر بھی اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس وقت میرے بچپن میں جو باتیں وہ مجھ سے کرتی تھیں وہ ایک طرح کی خود کلامی ہوتی تھی۔ وہ ایسی باتیں تھیں جو وہ کسی اور سے نہیں کر سکتی تھیں۔ اکثر کہا کرتی تھیں کہ بدقسمت وہ ہے، جس کی بیٹی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تینوں بیٹیوں کو جن نازوں سے پالا پوسا اور پڑھایا لکھایا' وہ بیٹوں کو نہیں نصیب ہوئے۔ بعد میں ابا جان بھی اکثر اپنے دل کی بات مجھ سے اور اسما ہی سے کرتے تھے!

بس پھر سارا دن اماں جان مطمئن رہیں۔ وہ بار بار اس آیت کا ورد کرتی رہیں اور کہتی رہیں: 'ویسے تو سارے ہی قرآن پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے کہ اس نے ایسی زندہ کتاب ہم کو عطا فرمائی، لیکن اس آیت کا ہم سب پر بہت ہی بڑا احسان ہے کہ اس نے ایسے نازک وقت میں ہمیں حوصلہ دیا' بشارت دی اور ہماری دست گیری کی'۔

دوسری رات بھی آئی اور گزر گئی۔ اماں جان مطمئن رہیں' باہر مردوں سے اور اندر عورتوں سے گھر بھرا رہا۔ عورتیں روتی ہوئی آتی تھیں' مگر اندر آ کر جب اماں جان اور دادی اماں کا صبر دیکھتی تھیں تو خاموش ہو جاتی تھیں۔

ابا جان کی سزاے موت کے خلاف ملک بھر میں احتجاجی مظاہروں' ہڑتالوں اور سزا کی منسوخی کے مطالبات کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے مسلم ممالک ہی نہیں' بہت سے غیر مسلم ممالک کے مسلمانوں کی طرف سے بھی گورنر جنرل اور وزیراعظم کے نام برقی تار بارش کی طرح برس رہے تھے۔ ردعمل انتہائی وسیع اور ہمہ گیر تھا۔

۱۳ مئی کو اماں جان نمازِ عصر سے ابھی فارغ ہی ہوئی تھیں کہ جماعت اسلامی کے ایک صاحب آئے اور انھوں نے کہا: 'بیگم صاحبہ کو دروازے کے پاس بلائیے'۔ ہم سب ڈر گئے کہ پتا نہیں کیسی خبر ہے؟ اماں جان بھی بڑی گھبرائی ہوئی آئیں کہ یکدم دروازے کے پیچھے سے آواز آئی: 'بیگم صاحبہ مبارک ہو! مولانا کی سزاے موت ۱۴ سال قید بامشقت میں تبدیل ہو گئی ہے۔

اس کے علاوہ حکومت کے خلاف ایک بیان جاری کرنے کے جرم میں سات سال مزید قید بامشقت کی سزا سنائی گئی ہے۔ وہ صاحب تو اپنی کہے جا رہے تھے' ادھر اماں جان پہلا جملہ ہی سن کر کھڑے قد سے سجدے میں گر گئیں۔ ان کی دیکھا دیکھی ہم بچے بھی سجدے میں گر گئے۔ اب تو گھر کا ماحول ہی بدل گیا۔ سب طرف سے مبارک سلامت شروع ہوگئی۔ یہ کسی نے سوچا ہی نہیں کہ آگے ۲۱ سال کی قید ہے! اماں جان بار بار کہہ رہی تھیں: 'اللہ کا وعدہ سچا ہے' اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ'۔ پھر کہتیں: 'دیکھو' آیتیں اور حدیثیں خود اپنا مطلب سمجھا رہی ہیں' کہ ہم ایسے ہی حالات کے لیے ہیں اور یہ ہمارا مطلب ہے'۔

اس روز اماں جان نے ہم کو اپنا ایک خواب سنایا جو اباجان کی کورٹ مارشل سے سزاے موت سے صرف ایک دن پہلے انھوں نے دیکھا تھا۔ کہنے لگیں: 'میں نے دیکھا کہ ایک ہوائی جہاز آ کر اترا ہے اور اس میں تمھارے ابا جان ہم سب کو لے کر سوار ہو گئے ہیں۔ جہاز ہے کہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ آسمان کی طرف عمودی پرواز کر رہا ہے۔ مجھے سخت چکر آ رہے ہیں اور بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ پھر یک لخت ہوائی جہاز کہیں اتر جاتا ہے اور تمھارے ابا جان میرا ہاتھ پکڑ کر' سہارا دے کر جہاز سے اُتار رہے ہیں۔ اُدھر میری جان پر بنی ہوئی ہے اور اِدھر تمھارے ابا جان کی آواز آتی ہے: 'ذرا نیچے دیکھو تو سہی کہ تم کتنی بلندی پر آ گئی ہو'۔ پھر میں نیچے دیکھتی ہوں تو واقعی لوگ سڑکوں پر بونوں کی طرح نظر آ رہے ہیں اور بڑی بڑی اونچی عمارتیں کھلونوں کی طرح نظر آ رہی ہیں۔ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی'۔

خواب سنا کر کہنے لگیں: 'آج اس خواب کی تعبیر سامنے آئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ باری تعالیٰ کو جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھ سے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرانا مقصود نہیں تھا' بلکہ باپ کو خلیل اللہ اور بیٹے کو ذبیح اللہ بنانا تھا' اسی طرح ہم گناہ گاروں کو بھی اس بھاری آزمایش سے بخیروخوبی گزار کر بلندیوں تک پہنچانا تھا!'

اسی طرح جب ابا جان کو سزاے موت سنائی گئی' تو ہفت روزہ افریشیا، لاہور [۲۵ دسمبر ۱۹۷۵ء] میں سرگودھا کے میاں رحیم بخش نے روایت کیا: 'میں نے ایک خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا کرتے دیکھا تھا: 'یا اللہ رحم کر' مودودی' میرے دین کا نام لینے والا

ہے' تو اسے ابھی زندہ رکھ' وہ تیرے دین کا کام کر رہا ہے' خداوند رحم کر'۔ میاں رحیم بخش صاحب بیان کرتے ہیں کہ اچانک آواز آئی: 'اے محمدؐ، ہم نے تیری دعا قبول کی'۔ اس کے بعد اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ یہ صبح کا وقت تھا اور موذن اللہ اکبر کی صدا دے رہا تھا۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا' پھر اچانک میری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے اور میں بہت دیر تک سکتے کے عالم میں اپنی چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اس خواب کی تعبیر جلد سامنے آئی کہ سزائے موت ختم ہونے کا اعلان ہو گیا'۔

ایک مرتبہ کسی نے اماں جان سے کہا تھا: 'آپ کے درس قرآن و حدیث میں جو لطف آتا ہے' وہ کسی اور کے درس میں نہیں آتا'۔ انھوں نے جواب دیا: 'از دل خیزد بر دل ریزد۔ ان آیات اور احادیث کا مطلب جیسا ہم جانتے ہیں' کوئی دوسرا اسی وقت جان سکتا ہے جب وہ ایسے حالات سے گزرے جیسے حالات سے ہم گزرے ہیں'۔

اماں جان اور دادی اماں کی یہ پوری کوشش ہوتی تھی کہ بچے خوش و خرم رہیں اور ان کی نفسیات پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔ ہماری اماں جان کہتی تھیں: 'انسان کا بچپن خوشیوں سے بھرپور ہونا چاہیے اور اسے کبھی عدمِ تحفظ کا احساس نہ ہونے پائے۔ کیونکہ کسی بھی قسم کی محرومی اگر بچپن میں آدمی کو ڈس لے تو یہ چیز انسان کی شخصیت کو گہنا دیتی ہے۔ یہ تلخ یادیں پھر ساری زندگی آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہیں۔ ہر بچے کو اپنے گھر میں ایک اہم فرد کی طرح کا احساس ہونا چاہیے' بلکہ VVIP ہونے کا احساس ہونا چاہیے' تاکہ اس میں خود اعتمادی پیدا ہو سکے--- انھیں یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ میرے بچے' بچپن ہی میں بوڑھے ہو گئے ہیں اور ان کا بچپنا چھن گیا ہے۔ اس کے ازالے کے لیے انھوں نے بڑے جتن کیے اور مختلف طریقوں سے ہمیں مصروف رکھا۔

ایک روز ملتان جیل سے ابا جان کا پیغام آیا ہر بچہ مجھے الگ الگ خط لکھے'۔ چنانچہ ہم سب نے انھیں الگ الگ خط لکھے۔ پھر ان خطوں کے جواب میں ابا جان نے ہم سب کو اپنے ہاتھ سے علیحدہ علیحدہ خط لکھے اور ہم میں سے ہر ایک کو ایک ایک چھوٹی سی تھیلی بھیجی۔ ابا جان کی نیلے رنگ کی ایک قمیص جو پرانا ہو چکا تھا' اسے کاٹ کر انھوں نے خود سوئی دھاگے سے تھیلیاں سی تھیں۔ ان تھیلیوں میں چھلے ہوئے چلغوزے' بادام' کشمش' پستے اور اخروٹ بھرے ہوئے تھے۔ ہر تھیلی کے اوپر' آٹے کی لئی سے چسپاں کی ہوئی چِٹ پر ہم میں سے ہر ایک کا نام لکھا ہوا تھا۔ کسی

پر 'نور نظر' کسی پر 'جان پدر اور کسی پر 'جگر گوشہ' لکھنے کے بعد بچے کا نام لکھا ہوا تھا۔

ان خطوں اور تھیلیوں میں کیا تھا کہ انھیں دیکھ کر دادی اماں تو بلک بلک کر رو پڑیں، اماں جان کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ سارا دن خاموش رہیں۔ جیل سے آنے والی یہ چھوٹی چھوٹی تھیلیاں زبانِ حال سے اسی طرح بول رہی تھیں، جیسے کوئی جیتا جاگتا انسان۔ وہ جیل کی اداسی، تنہائی، بچوں سے دوری، گھر کی یاد اور معلوم نہیں کیا کیا بیان کر رہی تھیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ابا جان، عزم اور ارادے کا کوہ گراں تھے، لیکن وہ تھیلیاں جن پر جان پدر، گوشۂ جگر اور نور نظر کی چٹیں لگی ہوئی تھیں، یہ بتا رہی تھیں کہ ارادے اور عزم کے اس پہاڑ کے اندر دھڑکنے والا دل بھی ہے۔

دوسری طرف یہ نور نظر، جان پدر اور جگر گوشے اس وقت اتنے چھوٹے اور بے شعور تھے کہ جلدی جلدی اپنی اپنی تھیلی کھول کر خشک میوہ جات کے پھنکے مار گئے۔ انھوں نے اپنے بچپنے میں یہ بھی نہ سوچا کہ کس محبت والفت سے وہ چلغوزے، ابا جان نے اپنے ہاتھ سے چھیلے ہوں گے اور پھر کس محبت سے وہ تھیلیاں بنائی ہوں گی اور پھر کس پیار سے ہر بچے کا فرداً فرداً نام لکھا ہوگا۔ ہم بچوں نے تو اپنا کام کر لیا لیکن دادی اماں اور اماں جان نے وہ خالی تھیلیاں سنبھال کر رکھ لیں ---اب خیال آتا ہے کہ کاش وہ تھیلی آج بھی میرے پاس ہوتی، جس پر ابا جان نے جان پدر کے بعد میرا نام لکھا تھا۔ وہ تو ایک قیمتی اثاثہ اور قیمتی یادگار تھی!

اماں جان نے ایک مرتبہ دادی اماں سے التجا کی: 'آپ کسی کو بددعا نہ دیں کہ آپ کی دعا اور بددعا دونوں حرف بہ حرف لگتی ہیں۔ یہ وہ موقع تھا جب ۱۹۵۳ میں ابا جان جیل میں تھے اور دادی اماں نے کہا تھا: 'جس نے میرے بیٹے کو جیل میں سڑایا ہے، یا اللہ! تو اسے پلنگ پر ڈال کر ایسا سڑا کہ اس کا آدھا دھڑ گل جائے۔' اس کے چند ماہ بعد اخبارات میں خبر چھپی کہ پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد کو فالج ہو گیا۔

آخر کار ۲۹ اپریل ۱۹۵۵ کو قانونی سقم کی بنا پر ابا جان ۲۵ ماہ کی قید و بند کے بعد رِہا ہو کر گھر آ گئے۔ وہ بڑا ہی خوشیوں والا مبارک دن تھا۔ ہمارا گھر پھولوں، ہاروں اور مٹھائیوں سے بھر گیا۔ ہر طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ سارا دن اسی خوشی اور مسرت کے عالم میں گزرا اور جب رات ہوئی تو ہم سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔

خوشی اور تھکاوٹ کے مارے اس رات ہم بچوں نے نماز عشا بھی نہیں پڑھی، کہ یکدم اماں جان کی آواز کانوں میں پڑی: 'ذرا دیکھو ان بے شرموں کو، بجاے شکرانے کے نفل پڑھنے کے، انھوں نے فرض نماز بھی نہیں پڑھی۔ جب باپ کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی تو یہ کیسے نفل پڑھ پڑھ کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ بس نکل گیا مطلب! اب تھوڑی کبھی اللہ تعالیٰ سے واسطہ پڑنا ہے!' یہ سنتے ہی ہم اٹھے اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگے۔

اس پوری رات اماں جان شکرانے کے نفل پڑھتی رہیں، یعنی انھوں نے سزاے موت والی رات جو منت مانی تھی (کہ جب میاں خیریت کے ساتھ گھر واپس آئیں گے تو جس طرح آج حاجت کے ۱۰۰ نفل پڑھے ہیں، اسی طرح شکرانے کے ۱۰۰ نفل پڑھوں گی) اس کو پورا کر رہی تھیں۔ لیکن اس مرتبہ انھوں نے چاے کا تھرموس اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چاے پیتی تھیں، جب کہ سزاے موت کی خبر سننے کی اس ہولناک رات میں بالکل چاے نہیں پی تھی۔

صبح کو اماں جان کہنے لگیں: 'انسان بھی کتنا ناشکرا ہے۔ جب میاں کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور موت سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی تو یہ ۱۰۰ نفل بہت تھوڑے لگ رہے تھے۔ نہ نیند آئی، نہ تھکاوٹ محسوس ہوئی، نہ طبیعت بوجھل ہوئی اور نہ دھیان ہی اِدھر اُدھر ہوا۔ جو الفاظ زبان سے نکل رہے تھے، وہی دل سے بھی نکل رہے تھے۔ کمر بعد میں جھکتی تھی، دل پہلے جھک جاتا تھا۔ لیکن کل رات کبھی نیند آتی تھی، کبھی تھکاوٹ محسوس ہوتی تھی اور کبھی سر میں درد ہوتا تھا۔ وہ 'جذب اندروں' سرے سے نصیب ہی نہ ہوا جو اس مرتبہ ملا تھا'۔ اس کمزوری کا ذکر کرنے کے ساتھ میں، اماں جان توبہ اور استغفار بھی کر رہی تھیں: 'سچ ہے، ہم حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کر سکتے، چاہے ساری عمر سجدے میں گرے رہیں'۔

ایک بار اماں جان نے بچوں کی شرارتوں سے تنگ آ کر ابا جان سے کہا: 'کوئی باپ بھی اولاد کا اتنا لاڈ پیار نہیں کرتا، جتنا آپ کرتے ہیں۔ کبھی تو ان کی شان میں بھی گستاخی کر دیا کیجیے۔ کبھی تو ڈانٹ ڈپٹ کر کے ان کی باز پرس کیجیے!'

اس پر ابا جان نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: 'تم کو کیا معلوم کہ جب میں جیل میں

ہوتا ہوں تو ان کے لیے کتنا اداس ہوتا ہوں۔ میں ان کی صورتوں کو ترس جاتا ہوں‘ ان کی آوازیں سننے کے لیے تڑپ جاتا ہوں۔ جب میں ۱۹۵۳ء میں جیل گیا تھا تو میرے [سب سے چھوٹے] بیٹے خالد [پ: ۱۷ ستمبر ۱۹۵۲ء لاہور] نے نیا نیا بولنا سیکھا تھا۔ جیل میں اس کی توتلی باتیں میرے کانوں میں گونجتی تھیں۔ میں محسوس کرتا تھا کہ میرا سب سے قیمتی اثاثہ چھن گیا ہے کہ جب کبھی میں جیل سے باہر آؤں گا تو خالد بڑا ہو چکا ہوگا اور اس کے بچپن کا وہ اسٹیج گزر چکا ہوگا۔ پھر تو وہ پکی پکی باتیں کرنے لگے گا۔ میں جیل میں‘ اپنے تصور میں انھیں دیکھتا تھا اور ان سے باتیں کرتا تھا۔ اب تم کہتی ہو کہ میں انھیں ڈانٹ ڈپٹ کروں اور ڈراؤں دھمکاؤں! یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا‘۔

پھر ایک اور موقعے پر ابا جان نے کہا تھا: ’یہ بچے تم کو آسانی سے‘ بغیر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگے‘ اتنے سارے مل گئے ہیں‘ اس لیے کہتی ہو کہ یہ مجھے تنگ کرتے ہیں۔ جن کو یہ نہیں ملے ہوتے ہیں تم کیا جانو کہ وہ لوگ ان کو حاصل کرنے کے لیے کہاں کہاں جاتے ہیں‘ کیسا کیسا شرک کرتے ہیں اور کس کس جگہ جا کر اپنا ایمان گنواتے ہیں!‘--- ابا جان تو یہ کہہ رہے تھے اور ہم بھی وہیں کان لگائے یہ باتیں سن رہے تھے‘ جس پر اماں جان بہت خفا ہوئیں: ’آپ کی انھی باتوں کی وجہ سے یہ اتنے سر چڑھے ہیں!‘

جیل کی داستان

ہم بچوں کے اصرار پر ایک روز ابا جان نے ہمیں جیل کے حالات بتائے:

’جب مجھے لاہور سے ملتان جیل لے جایا گیا تو دوپہر کا وقت تھا۔ جو کمرہ دیا گیا تھا‘ اس میں چھت کا پنکھا نہیں تھا اور نلکے کی جگہ ہینڈ پمپ تھا۔ یہ اے کلاس قیدی کا کوارٹر تھا۔ ’سی کلاس‘ کا ایک مشقتی [قیدی ملازم] دیا گیا تھا‘ جو بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ تقریباً ۴۰ سال کا خوب تنومند آدمی تھا۔ پہلے تو اس نے مجھ کو غور سے دیکھا اور پھر یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ جلدی جلدی سامان سنبھالا۔ ہینڈ پمپ چلا کر غسل خانے میں پانی رکھا اور کہنے لگا: ’میاں جی‘ نہا لیجیے‘۔ میں غسل خانے سے نکلا تو دیکھا کہ پورے کمرے میں ریت بچھی ہوئی ہے اور اس پر پانی چھڑک کر‘ چارپائی بچھا کر بستر کر دیا گیا ہے۔ میں نے پوچھا: ’پہلے تو اس کمرے میں ریت نہیں تھی‘ یہ کیوں بچھائی ہے؟‘ تو وہ کہنے لگا: ’گرمی بہت ہے‘ میں اس ریت پر پانی ڈالتا رہوں گا‘ تاکہ کمرہ ٹھنڈا رہے اور آپ دوپہر کو

آرام کرسکیں'۔ 'جتنی دیر میں' میں نے ظہر کی نماز پڑھی' اتنی دیر میں اس نے کھانا تیار کرلیا اور بڑے سلیقے سے لاکر میرے سامنے رکھا۔ ساتھ میں بڑی معذرت کرتا رہا کہ مجھے آپ کے ذوق کے متعلق کچھ پتا نہیں ہے۔ بس جلدی میں جو ہوسکا' کرلیا ہے۔

'پھر اس مشققتی نے یہ چیز نوٹ کرلی کہ میں کس وقت کون سی دوا کھاتا ہوں۔ اس کے بعد وہ ناشتے کی' دوپہر کے وقت کھانے کی اور رات کو کھانے کی صحیح صحیح دوائیاں سامنے رکھ دیتا تھا۔ کبھی یہ کہنے کی ضرورت نہیں پیش آئی کہ تم نے صبح کے وقت کی دوا نہیں رکھی ہے'۔ ابا جان نے بتایا: 'اس نے جیل میں میری ایسی خدمت کی اور اس محبت سے خدمت کی کہ میں حیران رہ جاتا تھا۔

'ایک دن اس مشققتی نے مجھ کو یہ بتایا کہ جب اس کوارٹر میں میری ڈیوٹی لگائی گئی تھی تو مجھے بتایا گیا تھا کہ ایک نہایت خطرناک قیدی آرہا ہے' جس نے حکومت کو سخت پریشان کررکھا ہے! بس اس کو راہ راست پر لانا ہے۔ اس کو اتنا تنگ کرو کہ خاموشی سے معافی نامے پر دستخط کر دے اور حکومت جو شرائط منوانا چاہے مان لے۔ بس تمھارا کام اسے ہر طرح سے تنگ کرنا ہے۔ کھانا اتنا بدمزہ پکانا کہ زبان پر نہ رکھا جائے۔ بس جی' میں کوارٹر میں بیٹھا آپ کا انتظار کررہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ذرا دیکھوں تو سہی کہ آج کیسے شخص سے پالا پڑتا ہے؟ آخر میں بھی جرائم پیشہ آدمی ہوں' کسی سے کم تو نہیں ہوں! پھر جب آپ اندر آئے تو میں آپ کو دیکھ کر بس سوچتا ہی رہا کہ بھلا آپ جیسے شخص سے بھی کسی کو کوئی خطرہ ہوسکتا ہے؟ میاں جی' آپ کو دیکھتے ہی پہلی نظر میں آپ کی محبت نے میرے دل میں گھر کرلیا۔

'پھر ایک روز سپرنٹنڈنٹ جیل آئے اور پوچھا: 'کوئی شکایت ہو تو بتائیں۔ میں نے کہا: 'مجھے تو کوئی شکایت نہیں ہے' میں بالکل آرام سے ہوں'۔ سپرنٹنڈنٹ جیل دوسرے تیسرے دن آتے رہے اور یہی سوال پوچھتے رہے۔ آخر ایک روز پوچھ ہی لیا: 'آپ یا تو تکلفاً یہ کہہ رہے ہیں یا پھر صحیح بات نہیں بتا رہے۔ میں نے کہا: 'بھائی' اگر کبھی کوئی تکلیف ہوئی تو بلا جھجک آپ کو بتا دوں گا' فی الحال کوئی بھی تکلیف نہیں ہے'۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا: 'فلاں فلاں لیڈر اور سیاست داں حضرات اسی جیل کے اسی کوارٹر میں صرف تین دن میں معافی نامے پر دستخط کر کے چلے گئے تھے' یہ معافی نامے حکومت کی فائلوں میں محفوظ رہتے ہیں اور جب یہ حضرات ذرا زیادہ

ہی بڑھ بڑھ کر بولتے ہیں' تقریریں کرتے ہیں اور بیانات داغتے ہیں تو ان کو صرف ایک اشارہ کافی ہوتا ہے کہ آپ کا معافی نامہ کل کے اخبارات میں چھپوا دیا جائے گا' بس اتنا سنتے ہی ان کو سانپ سونگھ جاتا ہے اور ایک صاحب تو دو ہی دن میں رو رو کر معافیاں مانگ کر یہاں سے چلے گئے۔ آپ کس قسم کے آدمی ہیں کہ بڑے خوش بیٹھے نظر آ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں بالکل آرام سے ہوں۔

'اس پر میں نے انھیں سمجھایا: 'بھائی! جب زندگی ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے گزاری جاتی ہے تو پھر یہ گرمی سردی یا جیل کی کوٹھری جیسی منزلیں بالکل ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ میں نے یہ راستا خوب سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ برتر از اندیشہ سود و زیاں ہے زندگی' کے مصداق ذاتی آرام اور تکلیف سے میں بے نیاز ہو چکا ہوں'۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب پھر کہنے لگے: 'آخر آپ اپنے آٹھ بچوں کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں؟ ان کے بارے میں بھی تو کچھ سوچیے۔ میں نے جواب دیا: 'بچوں کو تو میں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر آیا ہوں۔ اب وہ جانے اور بچے جانیں۔ ان کی طرف سے میں بالکل فکرمند نہیں ہوں:

کارساز ما بفکر کار ما
فکر ما در کار ما' آزار ما

[ہمارا کارساز' دن رات ہمارے کام بنانے میں لگا ہوا ہے' جب ہم اپنی فکر خود کرتے ہیں تو یہ ہماری جان کا آزار ہوتا ہے]

یہ سن کر سپرنٹنڈنٹ صاحب مایوس ہو کر چلے گئے۔ معافی نامے پر دستخط کرانے کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔

پھر اباجان نے بتایا: 'جب میں تفہیم القرآن لکھنے میں مصروف ہوتا تھا' یا جب میں نماز پڑھ رہا ہوتا تھا تو مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مشقتی (قیدی ملازم) ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھتا رہتا ہے۔ کچھ عرصے بعد بقرعید آ گئی۔ اتفاق سے جو راشن جیل سے دیا جاتا تھا' وہ ختم ہو چکا تھا اور مزید راشن ابھی پہنچا نہیں تھا کہ عید کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ عید کی صبح کو راشن بالکل ختم ہو چکا تھا۔ وہ سخت پریشان تھا کہ راشن پہنچا نہیں' اب آپ کو ناشتا کیسے دوں؟ یہاں تک کہ بات کرتے کرتے اس کے منہ سے جیل انتظامیہ کے لیے ایک دو مغلظات نکل چکی تھیں۔ 'میں نے

اس سے کہا: 'رات کو جو چنے کی دال اور روٹی بچی تھی، وہی گرم کر کے لے آؤ'۔ کہنے لگا: 'وہ تو میں آپ کو کبھی نہیں دوں گا! بھلا عید کے دن بھی کوئی رات کی باسی دال روٹی کھاتا ہے؟' میں نے اسے سمجھایا: 'بھائی! میری فکر نہ کرو، میں بڑی خوشی سے دال روٹی کھالوں گا' (چونکہ ابا جان صبح آٹھ بجے ناشتا کرنے کے عادی تھے اور اپنے معمولات میں وقت کے سخت پابند تھے، اس لیے انھوں نے آرام سے دال روٹی کا ناشتا کرلیا۔ یہاں پردادی اماں کی تربیت رنگ لا رہی تھی جو انھیں کبھی سونے کا نوالا کھلاتی تھیں اور کبھی چٹنی روٹی)۔ 'جس وقت میں ناشتا کر رہا تھا تو کسی کے سسکیاں بھر کر رونے کی آواز آئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی مشقتی بیٹھا رو رہا تھا۔ پوچھا: 'کیا بال بچے یاد آرہے ہیں؟' کہنے لگا: 'میں تو آپ کو دال روٹی کھاتے دیکھ کر رو رہا ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ عید کے دن، رات کی باسی دال روٹی تو ہم غریبوں نے بھی کبھی نہیں کھائی۔ آپ تو بڑے آدمی ہیں، آپ نے بھلا کہاں کھائی ہوگی؟'' میں نے اسے شفقت سے سمجھایا: 'دیکھو بھائی! یہ راستہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اختیار کیا ہے اور میں بڑی خوشی سے اس راہ پر چل رہا ہوں۔ اگر کبھی بالکل بھوکا بھی رہنا پڑا تو ان شاءاللہ میں آرام سے رہ لوں گا۔ تم میری وجہ سے رنجیدہ نہ ہوا کرو'۔

ابا جان نے مزید بتایا: 'میں تو ناشتا کر کے تفہیم القرآن لکھنے بیٹھ گیا، لیکن اس بے چارے مشقتی نے احتجاجاً ناشتا نہ کیا (اگرچہ اس کے لیے دال روٹی بچی ہوئی رکھی تھی)۔ اتنے میں کوارٹر کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ مشقتی نے دروازہ کھولا تو ایک سنتری کئی ناشتے دان، بڑے بڑے پیکٹ اور گٹھریاں اٹھائے کھڑا کہہ رہا تھا: 'مولانا صاحب، آپ کے چاہنے والے تو فجر کے وقت ہی یہ چیزیں لے آئے تھے اور جیل کے دروازے پر کھڑے تھے، لیکن سپرنٹنڈنٹ صاحب کا دفتر عید کی نماز کے بعد کھلا۔ اس کے بعد ان چیزوں کی تلاشی اور جانچ پڑتال ہوئی اس لیے دیر لگ گئی'۔ اب جو قیدی ملازم نے وہ پیکٹ، ناشتے دان اور گٹھریاں کھولیں تو ان میں انواع و اقسام کی نعمتیں تھیں۔ میں نے اپنے جیل کے مشقتی ساتھی سے کہا: 'دیکھو، یہ سب تمھارے لیے آیا ہے، کیونکہ تم ہی اداسی میں بھوکے بیٹھے رو رہے تھے، اب خوب جی بھر کر کھاؤ اور باقی چیزیں دوسرے قیدیوں میں بانٹ آؤ۔ آخر یہ پراٹھے، شامی کباب، حلوہ پوری، شیر خورمہ اور مٹھائیاں ان کو بھی تو اچھی لگیں گی۔ میں یہ کہہ رہا تھا، مگر میرا مشقتی ساتھی کفِ افسوس مل رہا تھا: 'کاش! وہ دال روٹی میں نے آپ کو دینے کی بجائے کوؤں کو کھلا دی ہوتی'۔ میرے بہت کہنے پر اس نے

ناشتا کیا اور باقی ساری چیزیں دوسرے قیدیوں میں بانٹ آیا اور ساتھ ہی ساتھ ان سے کہتا: 'میرے میاں جی کے لیے یہ سب چیزیں آئی تھیں' انھوں نے تمھیں بھجوائی ہیں!'

پھر ابا جان نے کہا: 'عید کے روز دوپہر ہوئی تو اسی طرح دروازہ کھٹکھٹایا گیا اور پھر اسی طرح ناشتے دان اور ہانڈیاں کپڑے میں بندھی ہوئی آگئیں۔ ایسے ایسے کھانے آئے کہ مشقتی ساتھی تو حیران رہ گیا۔ اس نے مجھے کھانا کھلایا اور باقی قیدیوں میں بانٹ آیا۔ رات کو پھر اتنا ہی کھانا آگیا۔ غرض یہ کہ عید کے تین دن ہمارے رفقا نے ملتان جیل میں اتنا زیادہ اور ایسی ایسی انواع واقسام کا کھانا پہنچایا کہ سارے جیل والے عش عش کر اٹھے'۔

اِدھر ابا جان ہمیں یہ تفصیلات بتا رہے تھے' اُدھر اماں جان ہمیں متوجہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں: 'دیکھو' سورہ مریم میں یہی بات کہی گئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَـهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝ (سورہ مریم: ۹۶)

کہ جو اہل ایمان نیک اعمال کرتے ہیں' رحمٰن ان کے لیے لوگوں کے دلوں میں محبت ڈال دیتا ہے۔

وہ اسی طرح زندگی کے واقعات کو آیات اور احادیث کے ساتھ منطبق کرکے' ہمیں ان کا مطلب سمجھایا کرتی تھیں۔ آج بھی اماں جان کے یہ الفاظ کانوں میں گونجتے ہیں: 'تم عمل تو کرکے دیکھو' پھر آیتیں اور حدیثیں خود اُٹھ کر تم کو اپنا مطلب سمجھائیں گی'۔

اسی قید کے دوران جیل کے حالات و واقعات بیان کرتے ہوئے ابا جان نے بتایا: 'ایک روز دوپہر کے وقت اچانک میرے کوارٹر کی دیوار کی دوسری جانب سے آواز آئی: 'جنرل صاحب کا کھانا پکڑلو'۔ مشقتی نے جاکر آواز دی: 'کون ہے؟' تو دیوار کی دوسری طرف سے ایک چنگیر پر رومال میں لپٹی ہوئی روٹیوں کے اوپر سالن کا ڈونگا اور سلاد رکھی ہوئی پکڑائی گئی اور پھر فوراً ہی جنرل محمد اکبر خاں صاحب (راولپنڈی سازش کیس والے' جن کا کوارٹر ابا جان کے کوارٹر سے متصل تھا) دیوار پھاند کر میرے احاطے میں آگئے اور کہا: 'میں آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گا'۔

'دوسرے دن پھر اسی طرح ان کے مشقتی نے آواز دی: 'جنرل صاحب کا کھانا

پکڑلو'۔ جیسے ہی کھانا پکڑا' جنرل صاحب دیوار پھاند کر آ گئے اور کہنے لگے: 'جب [کمیونسٹ] روس کی طرف سے وزیراعظم لیاقت علی خاں کو دورے کا دعوت نامہ آیا تھا تو اسی وقت امریکا سے بھی دعوت نامہ موصول ہوا۔ سوال یہ ہے کہ روس کا دعوت نامہ کیوں مسترد کیا گیا؟'۔ پھر کہنے لگے: 'امریکا کا سرمایہ دارانہ نظام' روس کے اشتراکی نظام سے زیادہ خطرناک ہے۔

ابا جان نے بتایا: 'اسی اثنا میں کسی نے جیل کے حکام کو مخبری کر دی کہ جنرل اکبر خان صاحب دیوار پھاند کر میرے پاس آتے ہیں اور ہم دونوں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس 'خوفناک انکشاف' نے تو گویا جیل کے در و دیوار ہلا دیے اور بس پھر کیا تھا چند گھنٹوں کے اندر اندر وہاں پر موجود راولپنڈی سازش کیس کے سارے قیدیوں کو پولیس کی گاڑیوں میں بھر کر دوسری جیلوں کو روانہ کر دیا گیا۔ میرے مشقتی نے ان کی روانگی کا آنکھوں دیکھا حال آ کر سنایا کہ پولیس کی گاڑی میں سوار ہوتے وقت جنرل اکبر خان صاحب نے نعرہ لگایا: 'اب وقت شہادت ہے آیا'۔ جیل والوں کو خطرہ ہوا ہوگا کہ کہیں یہ دونوں مل کر کوئی 'جیل سازش' نہ تیار کر بیٹھیں'۔

تفہیم القرآن و تفہیم الحدیث کا منصوبہ

گھر میں جب کبھی ابا جان کو **تفہیم القرآن** لکھنے کا موقع نہ ملتا تو کہا کرتے تھے: 'دیکھو تم لوگ مجھے **تفہیم القرآن** لکھنے نہیں دے رہے ہو' اب میں جیل جانے ہی والا ہوں۔ جب بھی میں یہاں مصروفیت کی وجہ سے تفہیم نہیں لکھ پاتا تو اللہ تعالیٰ مجھے لے جا کر جیل میں بٹھا دیتے ہیں' جہاں زیادہ اطمینان سے لکھتا رہتا ہوں'۔ ساتھ میں یہ بھی کہتے تھے کہ '**تفہیم القرآن** مکمل کرلوں تو اسی اسلوب میں **تفہیم الحدیث** بھی لکھنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں'۔

ہمارے تایا جان [سید ابوالخیر مودودیؒ] ' ابا جان پر زور دیتے تھے کہ وہ خود کو سیاست میں الجھانے کی بجائے علمی اور لکھنے پڑھنے کے کام پر زیادہ توجہ دیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ تایا جان نے ابا جان سے کہا تھا کہ وہ: '**تفہیم القرآن** کی پہلی دو جلدوں پر نظر ثانی کریں' کیونکہ ان کو پڑھتے ہوئے تشنگی کا احساس ہوتا ہے'۔ لیکن ابا جان نے کہا: 'اگر میں نے پہلی دو جلدوں پر نظر ثانی کی تو پھر تیسری پر بھی نظر ثانی کرنے کا مطالبہ آئے گا اور پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہے گا'۔

جب کبھی ابا جان جلسوں اور دوسری سیاسی و اجتماعی سرگرمیوں وغیرہ میں بہت زیادہ مصروف ہو جاتے تھے تو تایا جان انھیں سمجھاتے تھے: 'یہ کام کرنے کے لیے اور دوسرے لوگ موجود ہیں۔ لیکن تحقیقی، علمی اور تصنیفی کام اور وہ بھی اس پائے کا کام جو آپ ہی کر سکتے ہیں' کرنے والے اور کتنے ہیں؟' وہ ابا جان کو نصیحت کرتے تھے: 'آپ اپنا سارا وقت لکھنے میں گزارا کریں'۔ ایک مرتبہ جماعت کے ایک صاحب سے تایا جان نے کہا تھا: 'یہ جو تمھارے مولانا ہیں نا' یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میں نے اسے اپنے ساتھ سلایا ہے اس کی ضدیں پوری کی ہیں' اس کے ناز اٹھائے ہیں۔ میرا دل بہت دکھتا ہے جب تم اسے جلسوں اور جلوسوں میں کھینچے پھرتے ہو اور اس کو سیاست میں الجھاتے ہو۔ یوں اس کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ یہ علمی تحقیقی اور تصنیفی کام کرے تو کئی نسلیں استفادہ کریں گی'۔

اسی لیے اماں جان ہم بچوں پر بہت زور دیتی تھیں: 'اپنے ابا جان کو تنگ نہ کیا کرو'۔ جب کبھی بچے کسی چیز کے لیے تقاضا کرتے تو اماں جان ہمیں سمجھایا کرتی تھیں: 'اگر میں ہر وقت تمھارے والد کی جان کھاتی رہتی کہ اب مجھے یہ اور یہ چاہیے اور میرے بچوں کو ایسی ایسی چیزیں درکار ہیں' تو یہ ساری کتابیں جو انھوں نے لکھی ہیں' وہ نہ لکھ سکتے۔ تمھارے باپ ایک ریسرچ اسکالر ہیں' ایک مصنف اور محقق ہیں۔ ان کو خاموشی' سکون اور اطمینان کی ضرورت ہے۔ تم ان سے کوئی مطالبہ نہ کیا کرو اور نہ ان کے سامنے اپنے تعلیمی مسائل بیان کیا کرو۔ ان کو اپنی باتوں میں بھی نہ الجھایا کرو'۔ اس طرح اماں جان نے ابا جان کو ایسا سکون اور اطمینان مہیا کیا کہ وہ جو کچھ لکھتے تھے' ذہنی طور پر پوری طرح یکسو ہو کر اور جم کر لکھتے تھے۔

ابا جان' منافقت' تصنع' ظاہر داری اور ریا کاری سے سخت متنفر تھے۔ ایک مرتبہ کھانے کی میز پر' کھانا کھاتے ہوئے اماں جان نے ہم سب بہن بھائیوں کو مجموعی طور پر' اور خصوصاً محمد فاروق [پ: ۲۷ نومبر ۱۹۴۳ء' دہلی] کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: 'بیٹا' نماز پابندی سے پڑھا کرو' اگر تم لوگ نماز نہیں پڑھو گے تو لوگ کیا کہیں گے کہ مولانا مودودی کے بچے نماز نہیں پڑھتے۔ ابا جان کھانے کے دوران خاموش رہے اور جب اٹھے تو بیسن پر ہاتھ دھونے کے بعد پان کی ڈبیا اٹھا کر چلتے چلتے کہا: 'لیکن بیٹا' جب بھی نماز پڑھنا' خدا کی نماز پڑھنا' اپنے باپ کی پڑھنے کے

لیے کھڑے نہ ہونا اور خاموشی سے اپنے دفتر کی طرف چل دیے۔ اس طرح اباجان بڑی بڑی بات ایک جملے میں کہہ دیا کرتے تھے' بحث کرنا ان کی سرشت ہی میں نہ تھا۔

اباجان نے جتنا لکھا ہے' اگر ان کی تحریروں کو جمع کیا جائے اور صفحات کا حساب لگا کر ان کی زندگی کے ایام سے آپ تقسیم کریں تو دیکھیں کہ فی یوم کتنے صفحے آتے ہیں۔ اب اس کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی جن طوفانی ادوار سے گزرتی رہی' اس کو اگر دیکھیں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنا کام وہ کیسے کر گئے؟ یہ کام مکمل ذہنی یکسوئی اور سکون کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا اور یہ سکون ان کو اماں جان نے مہیا کیا تھا۔

اباجان نے سورۂ یوسف کی جو تفسیر لکھی ہے' اسے پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس وقت وہیں کہیں موجود تھے اور آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں۔ سورۃ الکھف یا سورۃ الفیل کی تفسیر پڑھتے ہوئے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ گویا وہ ذہنی طور پر اسی زمان و مکاں (time and space) میں منتقل ہو گئے تھے۔

برسوں بعد طالبات کے کالج جدہ میں' شعبۂ عربی کی شامی النسل سربراہ مجھ سے کہنے لگیں کہ ایک فقرے میں اپنے والد کی صفت بیان کرو تو میرے منہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکلا: اِنَّہٗ کَانَ یَعِیشُ فِی عَالَمِ الثَّانِیُ (کہ وہ ایک اور ہی دنیا میں رہتے تھے)۔ وہ اس جواب سے بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں: 'امام ابن تیمیہؒ [م:۱۳۲۸ء] کی بھی یہی صفت تھی۔

اباجان کی خواہش ہوتی تھی کہ جب وہ کھانے کی میز پر آئیں تو سبھی وہاں موجود ہوں۔ بچوں سے ملنے کا یہ واحد وقت تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ سب بچے ان کے ساتھ کھانا کھائیں۔ اپنے معمولات میں وہ اس قدر پابندی وقت ملحوظ خاطر رکھتے تھے کہ چاہیں تو آپ ان سے گھڑی ملالیں۔ اسی لیے ہم ان کے آنے سے پہلے کھانے کی میز پر آ جاتے تھے۔ لیکن اکثر ایسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کھانا تو کھا رہے ہیں' لیکن ذہنی طور پر کھانے کے دوران بھی وہ کچھ سوچ بچار میں مصروف ہیں۔

اباجان ہم کو نصیحت کرتے ہوئے اکثر کہا کرتے تھے: 'انسان خیر اور شر کا مرکب ہوتا ہے۔ آدمی کا کمال یہ ہونا چاہیے کہ وہ دوسرے کی خیر سے فائدہ اٹھائے اور اس کے شر سے اپنے

آپ کو محفوظ رکھے۔ سخت نادان ہوتا ہے وہ شخص، جو دوسرے کے شر سے تو نقصان اٹھائے اور ان کی خیر سے محروم رہ جائے'۔

سخت کلامی یا طعنہ زنی تو ان کی سرشت ہی میں نہ تھی۔ اگر کبھی کسی کو سخت جملہ کہتے بھی تھے تو اسی وقت جب انھیں بہت ہی زیادہ کوفت پہنچی ہو اور وہ جملہ بھی یہ ہوتا: 'ان لوگوں کے نزدیک' میری شرافت میرا سب سے بڑا جرم ہے'۔ پھر بھی حتی الامکان ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ دوسروں کی خیر کو اپیل کریں اور اس کو ابھار کر بروے کار لائیں اور ان کے شر کو دفع کریں۔ یہ پون صدی کی جاں گسل کش مکش ہے، جس میں وہ بڑی حکمت اور تدبر سے ملت اسلامیہ کی اصلاح کے کام میں لگے رہے۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ اباجان کی شادی اگر کسی جاہل اور خواہ مخواہ مطالبے کرنے والی جھگڑالو قسم کی عورت سے ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا۔ اماں جان کو تو شاید اللہ تعالیٰ نے بنایا ہی اباجان کے لیے تھا۔ ان کا اعلیٰ ادبی ذوق، بلند پایہ علمی رجحان، اپنی ذات کی نفی، خودداری اور اباجان کی دل داری کی تو کوئی حد ہی نہیں تھی۔ عربی زبان کا ایک محاورہ ہے: 'البنات عود' کہ خواتین خوش بو ہوتی ہیں، جو خود تو پردے میں رہتی ہیں، مگر ان کا سلیقہ اور تھوڑے سے پیسوں میں بنائی ہوئی بہت ساری عزت اور بچوں کی تعلیم و تربیت سب کو نظر آتی ہے۔

اباجان ہم سے کہا کرتے تھے: 'اگر مجھے تمھاری تربیت کی پوری طرح مہلت ملتی تو تمھیں دنیا کی مثالی اولاد بناتا۔ چونکہ میں تم پر بھرپور توجہ نہیں دے سکا، اس لیے تم سے باز پرس کا حق بھی نہیں رکھتا۔ میں نے اپنا وقت دین کے کاموں اور اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے وقف کر دیا ہے، اس لیے تمھاری تربیت اللہ کے سپرد کرتا ہوں'۔ بس اس طرح وہ اپنی زندگی کا ہر لمحہ اللہ کے دین کی ڈیوٹی انجام دینے میں لگاتے رہے۔

انتقال سے چند ماہ پیش تر ایک صاحب نے دورانِ ملاقات بے رحمانہ تنقید کرتے ہوئے اباجان سے کہا: 'ایران میں آیت اللہ خمینی صاحب [م: ۴ جون ۱۹۸۹ء] اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوگئے، مگر آپ پاکستان میں کیوں اسلامی انقلاب نہیں لا سکے؟'

اباجان نے جواب دیا: 'میں تو اللہ تعالیٰ کے کام کے لیے 'دہاڑی' کا مزدور ہوں۔ مجھے

اپنے حصے کی دہاڑی کرنی ہے اور اپنے مالک سے اجرت لینی ہے۔ اب یہ کہ عمارت کب مکمل ہوگی، کیسی ہوگی؟ مکمل ہو بھی سکے گی یا نہیں؟ اس سے مزدور کو کیا غرض۔ اسے تو ایمان داری سے اپنی دہاڑی سے غرض ہے۔

مراد یہ کہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ابا جان نے اللہ کی راہ میں اپنے حصے کی 'دہاڑی' کرنے میں گزارا' زبان اور قلم سے' فکر اور عمل سے' غرض ہر طرح سے اپنا فرض انجام دیا۔ وہ نہ زندہ باد کے تمنائی تھے اور نہ مردہ باد کے نعروں سے کبھی خائف ہوئے۔ عام انسانوں سے موازنہ کر کے دیکھیں تو یوں لگتا ہے کہ ان کی ذات' ان کا جسم' ان کی ضروریات' ان کی اولاد اور ان کا مستقبل' ان کے نزدیک شاید کوئی وجود ہی نہیں رکھتا تھا۔ ہم نے ابا جان کو ان کی پوری زندگی میں جتنا بے نیاز دیکھا ہے' ایسی بے نیازی کسی اور فرد میں نہیں دیکھی۔

دادی اماں ہم بچوں سے کہا کرتی تھیں: 'اصل نسل سید میں کچھ بنیادی صفات ہوتی ہیں۔ جب کوئی تم سے کہے کہ میں سید ہوں تو اسے سات چیزوں میں پرکھو: ● سید کو طیش نہیں آتا' اور آتا ہے تو صرف دین کے معاملے میں آتا ہے ● سید کبھی ذاتی انتقام نہیں لیتا ● سید کبھی گالی کے جواب میں گالی نہیں دیتا ● سید کسی کے لیے دل میں کینہ نہیں رکھتا ● سید کبھی جھوٹ نہیں بولتا' کسی کی غیبت نہیں کرتا ● سید کھانے میں عیب نہیں نکالتا۔ بھوک اور پیاس سے کبھی بے حال نہیں ہوتا۔ جو سامنے آئے' صبر سے کھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے ● سید پر زندگی میں کبھی نہ کبھی سخت وقت آتا ہے اور اس کی جان تک خطرے میں ہوتی ہے' لیکن وہ ہمت نہیں ہارتا' اللہ کے بھروسے پر ہر خطرے سے لڑ جاتا ہے اور بدترین حالات سے ٹکر لے لیتا ہے'۔

دادی اماں کی یہ بیان کردہ خصوصیات درحقیقت بچوں کی تربیت اور ذہنی تشکیل کے اصول تھے تاکہ وہ اپنی نسبت کے حوالے سے ان امور کا خیال رکھیں۔ تاہم' ابا جان میں یہ ساتوں خصوصیات بھرپور انداز میں موجود تھیں۔ جن حالات میں عام آدمی غصے میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے' ان حالات میں بھی وہ تحمل اور کمال بردباری کا مظاہرہ کرتے تھے۔ کسی کے خلاف دل میں کینہ نہیں رکھتے تھے:

کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن
آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن

[ہمارے طریق زندگی میں کسی کے خلاف دل میں کینہ رکھنا کفر ہے۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ دل کو شیشے کی طرح صاف رکھا جائے۔]

وہ لوگ بھی، جو ابا جان کو سنگین سزائیں دینے اور بلا وجہ جیلوں میں رکھنے کے ذمے دار تھے، وہ بھی جب کبھی بعد میں ملنے آتے تو ابا جان ان سے بھی اسی خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے ملتے۔ کبھی انھوں نے باتوں باتوں میں بھی یہ جتانے کی کوشش نہیں کی کہ آپ لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک روا رکھا تھا۔

ایک روز، ایک صاحب ابا جان سے سفارشی خط لینے آئے۔ وہ اب ریٹائر ہو چکے تھے اور ہاتھ تنگ تھا مالی دشواریوں کی وجہ سے دبئی یا ابوظہبی جانا چاہتے تھے۔ حسبِ عادت، ابا جان نے سفارشی خط دے دیا، جو وہاں ان کے بہت کام آیا اور اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ یہ صاحب کون تھے؟ یہ وہی صاحب تھے، جنھوں نے فوجی ملازمت کے دوران مارشل لا عدالت کے جج کی حیثیت سے ابا جان کو پھانسی کی سزا سنائی تھی اور ان کے انگریزی میں دستخط آج تک فیصلے پر ثبت ہیں۔ پھانسی کی سزا سنانے والے کے لیے سفارشی خط اور یہ اعلیٰ ظرفی صرف ابا جان کا ہی حصہ تھی۔

جنرل محمد اعظم خاں، جن کے زمانے میں ابا جان کا کورٹ مارشل ہوا تھا، بعد میں اکثر ملنے آیا کرتے تھے۔ ابا جان تو حضرت مسیح علیہ السلام کے اس قول پر عمل کرتے تھے: 'اے مچھلیوں کو پکڑنے والو! آؤ، میں تمھیں انسانوں کا شکار کرنا سکھا دوں۔ اپنے قول سے، عمل سے اور اپنے فعل سے انسانوں کو شکار کرو اور انھیں اللہ کی بندگی کے جال میں لا ڈالو' (اپنے جال میں نہیں)۔

اپنے حسنِ اخلاق سے انھوں نے اپنے دشمنوں کے دلوں میں بھی گھر کر لیا۔ ہم گواہ ہیں کہ ابا جان نے اپنی ذات پر پھبتیاں کسنے والے بھٹو صاحب کے لیے بھی ہمیشہ کلمۂ خیر ہی کہا۔ ان کا نام انھوں نے ہمیشہ احترام کے ساتھ لیا اور ہمیشہ یہی کہا کہ: 'اللہ تعالیٰ انھیں راہِ راست پر لائے اور حالات کو بہتر بنائے تا کہ اس ملک کا اور اس قوم کا مزید نقصان نہ ہو'۔

ابا جان نے کبھی گالی کے جواب میں گالی تو دور کی بات ہے، پلٹ کر کبھی کوئی سخت لفظ

بھی نہیں کہا۔ مجھے یہ واقعہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہمارے بچپن میں ابا جان' اچھرہ کی ایک مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بعد واپس آئے تھے۔ امام مسجد' ابا جان کے شدید مخالف تھے۔ انھوں نے اپنے سامنے بیٹھے' ہمارے ابا جان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انھی کے خلاف سارا خطبہ جمعہ دیا اور آخر میں آ کر تان اس انوکھی منطق پر توڑی کہ اگر کوئی 'مودودیا' مر جائے اور اس کی قبر پر بیری کا درخت اگ آئے' تو اس بیری کے پتے کھا کر اگر کوئی بکری دودھ دے' تو وہ دودھ پینا بھی حرام ہے۔ ابا جان کے ساتھ جو بھائی نمازِ جمعہ پڑھنے گئے تھے' واپس آ کر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور ہمیں اس عالم کے خطبے کا یہ حصہ سنا رہے تھے۔ لیکن ابا جان انتہائی سنجیدگی اور متانت سے بیٹھے تھے' بلکہ حیران ہو ہو کر ہم ہنسنے والوں کی طرف دیکھ رہے تھے کہ بھلا یہ بھی کوئی ہنسنے کی بات ہے۔

اسی طرح ایک مرتبہ جامعہ اشرفیہ' لاہور کے ایک بہت بڑے عالمِ دین نے ابا جان سے کہا: 'مولانا احمد علی لاہوریؒ صاحب [م: ۲۲ فروری ۱۹۶۲ء] نے آپ پر تنقید کی ہے' مگر آپ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس خاموشی سے شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں'۔ ابا جان نے جواب میں کہا: 'مجھ پر جو آدمی بھی بلاوجہ تنقید کرتا ہے' بلاشبہ اس سے مجھے دکھ ہوتا ہے' لیکن اس حوالے سے مولانا احمد علی صاحب کا معاملہ بالکل جدا ہے۔ ان کی نیکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ وہ تنقید کرتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ ان کی نیکیوں کے صدقے ان کی یہ بے جواز تنقید' اللہ تعالیٰ بخش دے گا اور میری کوتاہیاں اتنی ہیں کہ میری خاموشی کی وجہ سے ان میں کچھ کمی واقع ہو جائے گی۔

•

ابا جان کو بھوک اور پیاس پر بہت زیادہ کنٹرول تھا۔ وہ کھانے میں کبھی کوئی عیب نہیں نکالتے تھے۔ اگر کبھی غلطی سے پکانے والی خاتون نمک زیادہ ڈال دیتی یا بالکل ہی ڈالنا بھول جاتی تو وہ عیب نکالے بغیر صبر وشکر سے کھا لیتے تھے اور اگر کسی بچے کے منہ سے حرفِ شکایت نکلتا تو کہتے تھے: 'روزانہ تو ٹھیک پکتا ہے' اگر کسی ایک دن کوئی کمی رہ بھی گئی ہے' تو بھلا اس میں الجھنے اور ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے!' انھیں دیکھ کر ہم سب بہن بھائی بھی کھانے میں اکثر عیب نہیں نکالتے تھے۔ اگر کسی کے منہ سے بے دھیانی میں ایسی ویسی بات نکل جاتی تھی تو فوراً دادی اماں

کہتی تھیں: 'یہ نقلی سید ہے' بلکہ نومسلم ہے بے چارہ' کیا کرے اپنی عادت سے مجبور ہے'۔ اسی لیے ڈر کے مارے کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ دادی اماں کے انتقال کے بعد بھی ہم بہن بھائیوں میں یہ کہنے کی روایت برقرار رہی اور کھانے میں عیب نکالنے والا 'نقلی سید' اور 'نومسلم' کہلاتا رہا۔

انھی دنوں کی بات ہے' فلسطینی مسلمانوں کا ایک وفد لاہور آیا اور ابا جان سے ملنے کا خواہش مند ہوا' جس پر ان کو شام کی چائے پر مدعو کیا گیا۔ ہمارے گھر آنے سے چند گھنٹے پہلے اطلاع ملی کہ ان کے ساتھ کچھ خواتین بھی ہوں گی۔ مخلوط محفل کی ہمارے گھر میں کوئی گنجایش نہیں تھی۔ ابا جان نے فوری طور پر خواتین کے لیے اندر کے لان میں انتظام کروایا اور ہمیں ہدایت کی کہ 'آپ لوگ ہی سب مہمان خواتین کی خاطر مدارات کریں گے'۔

یہ بھری برسات کا موسم تھا۔ جس وقت ٹینٹ سروس والے میزیں لگا رہے تھے' کالی سیاہ گھٹا گھر کر آ گئی اور ایسے لگتا تھا کہ بارش بس شروع ہونے ہی والی ہے۔ ہم لوگ بہت گھبرا گئے اور ابا جان سے کہا: 'اگر باہر مہمان خواتین کو بٹھایا اور بارش شروع ہوگئی تو کس قدر بھگدڑ مچے گی'۔ ابا جان نے نہایت اطمینان سے کہا: 'ان شاء اللہ' بارش نہیں ہوگی'۔ ہم نے کہا بارش تو بالکل تیار کھڑی ہے۔ ابا جان نے پھر اسی اطمینان سے زور دے کر کہا: 'میں نے کہا نا' ان شاء اللہ بارش نہیں ہوگی'۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے گھٹا چھٹ گئی اور نیلا صاف آسمان نکل آیا۔ ہوا ایسی خوش گوار چلی کہ دل خوش ہوگیا۔ مہمان آئے' آرام سے بیٹھے' چائے پی اور چلے گئے۔ جب سب مہمان چلے گئے اور ساری چیزیں اٹھالی گئیں تو بادل پھر گھر کر آ گیا۔ اس کے بعد تمام رات موسلا دھار بارش ہوئی' چھاجوں مینہ برسا۔

اس وقت ہماری اماں جان نے ہم سے کہا: 'دیکھو' یہ جو دونوں ماں بیٹے ہیں نا (ابا جان اور دادی اماں) یہ جو کچھ کہہ دیا کریں' اسے چپ چاپ مان لیا کرو۔ ان سے بحث نہ کیا کرو۔ یہ جو کچھ کہتے ہیں' اللہ تعالیٰ اکثر ان کی بات پوری کر دیتا ہے'۔ پھر اماں جان نے ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دو احادیث سنائیں:

۱- حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندوں میں بعض ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم کھالیں' اللہ ان کی قسم پوری کر دیتا ہے۔

۲- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہت سے پراگندہ بال والے، جن کے لیے دروازے نہیں کھولے جاتے' ایسے ہیں کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کو اس قسم میں سچا کر دیتا ہے۔

۱۹۵۷ء میں ۶ اور ۷ دسمبر کی درمیانی رات کو دو بجے مختصر علالت کے بعد دادی اماں انتقال کر گئیں۔ تمام عمر من مریضم تو طبیبم کہہ کر تندرست ہو جانے والی دادی اماں بالآخر اپنے طبیب حقیقی سے جا ملیں۔ یعنی ہمیشہ کے لیے شفایاب ہو گئیں۔

دادی اماں کے انتقال کے بعد عام لوگوں کا خیال تھا کہ اماں جی کے صاحبزادے اتنے نامی گرامی عالم دین ہیں' ضرور اپنی والدہ صاحبہ کے ایصالِ ثواب کے لیے قل' دسواں' بیسواں اور چالیسواں کریں گے اور خوب بریانی زردے کی دیگیں پکیں گی' حلوے اور نان بانٹے جائیں گے۔ لیکن دیکھنے والے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ابا جان نے نہ دادی اماں کے قل کیے اور نہ دوسری ہی رسوم اس پر جتنے منہ' اتنی ہی باتیں۔ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہا کہ 'یا اللہ تو سب کو نیک اولاد دے! ایسی اولاد تو کسی دشمن کو بھی نہ دے' جس نے اماں جی کو قبر میں اوندھا ڈال دیا اور پھر پلٹ کر بھی نہ پوچھا'۔ ان باتوں کا ہمارے گھر میں سب نے بہت برا مانا' لیکن ابا جان ان تبصروں سے بہت محظوظ ہوئے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ دیکھیے! یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ایک غریب آدمی جودمے کا پرانا مریض تھا اور مرض کی شدت کی وجہ سے اپنی روزی خود کمانے سے قاصر تھا' روزانہ دوپہر کو ہمارے گھر آتا تھا اور اس کو بڑی عزت سے کھانا کھلایا جاتا تھا۔ کھانے کے بعد وہ ہمارے گھر ہی میں چارپائی پر لیٹ جاتا تھا اور رات کو کھانا کھا کر اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ ابا جان کا حکم تھا کہ دوپہر کو اسے کھانا' دادا ابا کے ایصالِ ثواب کے لیے کھلایا جائے اور رات کو دادی اماں کے ایصالِ ثواب کا کھانا پیش کیا جائے۔ پھر اسی سال رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں سعودی عرب جانا ہوا تو ابا جان نے دادی اماں کے ایصالِ ثواب کے لیے حج کیا' اسی طرح کئی عمرے بھی کیے۔

اباجان کی تیسری گرفتاری

۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو اباجان پھر جیل چلے گئے اور کتابوں سے بھرے بڑے بڑے صندوق جیل جانے شروع ہو گئے۔ جیل والے بھی حیران ہوتے تھے کہ اے کلاس کے دوسرے قیدیوں کے لیے حلوے اور انواع و اقسام کے کھانے آتے ہیں، مگر مولانا صاحب کے لیے صرف کتابیں آتی ہیں۔ اس وقت اباجان لاہور جیل میں تھے، جہاں اب شادمان کالونی ہے۔ ہر ہفتے ہم ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ اس پورے عرصے اماں جان خاصی بیمار رہیں۔ دادی اماں بھی نہیں رہی تھیں۔ ان کی موجودگی اماں جان کے لیے بہت بڑا اخلاقی سہارا ہوتی تھی۔

گرفتاری سے کچھ عرصے پہلے، فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان [م: ۲۰ اپریل ۱۹۷۴ء] سے اباجان کی بڑی یادگار گفتگو ہوئی۔ یہ ملاقات لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں ہوئی تھی۔ گورنر مغربی پاکستان امیر محمد خان آف کالاباغ [م: ۲۶ نومبر ۱۹۶۷ء] بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ ایوب خان صاحب کا ارشاد تھا: 'مولانا آپ سیاست چھوڑ دیں۔ ملک کو اور حکومت کو آپ کی بڑی ضرورت ہے۔'

اباجان نے کہا: 'ایوب صاحب، آپ نے ساری زندگی فوج کی خدمت انجام دی ہے، بھلا آپ کس طرح مجھے زندگی کے اجتماعی معاملات میں دلچسپی لینے سے روک سکتے ہیں؟ اور کس اصول کے تحت سیاست سے دست کش ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں؟'

ایوب خاں صاحب نے فرمایا: 'مولانا، سیاست گندا کھیل ہے، آپ جیسے عالم شخص کو اس میں نہیں آنا چاہیے۔'

اباجان نے جواب دیا: 'تو آپ کا کیا خیال ہے اسے گندا ہی رہنا چاہیے؟ اس میں گندے لوگوں کے بجائے صاف ستھرے کردار کے لوگ آئیں گے تبھی تو یہ گندگی صاف ہوگی'۔

اس کے بعد ایوب صاحب نے کہا: 'آپ اپنے بچوں کے نام سے فیکٹریاں لگائیے، ہم آپ کو بنکوں سے قرضے دیں گے، آپ کو پرمٹ اور لائسنس دیں گے، جس عرب ملک میں آپ چاہیں ہم آپ کو سفیر بنا کر بھیج دیں گے'۔ مگر ان تمام پیش کشوں کے جواب میں، اِدھر ایک شانِ

استغنا تھی اور بس! اباجان نے صرف یہ کہا: 'آپ نے میرے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے'۔

ایوب صاحب حیران تھے کہ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں، جو روپے اور مٹی کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ اباجان اکثر ایک شعر پڑھا کرتے تھے' جو خود ان کے حسبِ حال تھا:

ہزار دینے کا ایک دینا ہے
اک دل بے مدعا دیا تو نے

اباجان نے ایک جگہ لکھا ہے: 'ایمان بالغیب قلب کی اس کیفیت کا نام ہے، جس کی بنا پر انسان غائبات کی خاطر مشاہدات اور موجودات کا انکار کر دیتا ہے۔ آخرت کی کامیابی کے لیے دنیوی فائدوں کو ٹھکرا دیتا ہے' دنیوی نقطۂ نظر سے سوفی صد خسارے کا سودا کر لیتا ہے اور اس پر مطمئن رہتا ہے! ایمان بالغیب کی بنا پر انسان دنیا اور دنیا کے فائدے اور نقصان سے دُور بہت دُور جنت کی طرف دیکھتا ہے اور معاملات کرتا ہے! اس کی نگاہ جنت کے نظاروں پر جمی ہوتی ہے۔ جنت کی نہروں' جنت کے پھل' اس کی چھاؤں اور اس کی راحتوں پر جمی ہوتی ہے۔

۱۹۶۴ء میں گرفتاری کے بعد اباجان پر 'بغاوت' کا مقدمہ چلایا گیا۔ اس وقت کے ہوم سیکرٹری صاحب نے اباجان کی موجودگی میں ہائی کورٹ کے سامنے حلفاً جھوٹی گواہی دی۔ غالباً اسی کے صلے میں ایوب خاں نے تھل کے علاقے میں ان کو خاصی معقول اراضی بطور انعام دی۔ ان صاحب نے اپنے دونوں بیٹوں کو اراضی کا قبضہ لینے کے لیے بھیجا۔ اراضی کے قدیم مالکان سخت طیش کے عالم میں تھے۔ انھوں نے مذکورہ سیکرٹری صاحب کے بیٹوں کو کلہاڑیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ لاشیں سارا دن سخت گرمی میں دھوپ میں پڑی رہیں۔ قاتل کسی کو لاشیں اٹھانے نہیں دے رہے تھے۔ آخر 'بڑے صاحب' پولیس کی بڑی بھاری جمعیت لے کر خود گئے اور لاشیں اٹھا کر لائے۔ ان کے صرف دو ہی بیٹے تھے۔ ایک کی عمر ۳۲ سال تھی اور دوسرے کی ۲۸ سال۔ ہمارے ایک مشترکہ ملنے والے ان کے ہاں تعزیت کو گئے تھے۔ انھوں نے ہمیں بتایا: 'بڑے صاحب اور ان کے سارے گھر والے اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ہم تو کانوں میں انگلیاں ڈال' چپ چاپ وہاں سے بھاگ آئے ورنہ ہم بھی گناہ گار ہوتے'۔

اباجان نے ایک جگہ لکھا ہے: 'افلاس، جہالت اور انگریز کی ڈیڑھ سو سالہ غلامی نے

ہمارے بیش تر افراد کو بے غیرت اور بندۂ نفس بنادیا ہے۔ وہ روٹی اور عزت کے بھوکے ہیں۔ ان کا یہ حال ہوگیا ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے اور نام نمود کے چند کھلونے پھینکے' یہ کتوں کی طرح اس کی طرف لپکے۔ اپنے دین اور ایمان' اپنے ضمیر' اپنی غیرت و شرافت' اپنی قوم و ملت کے خلاف کوئی بھی خدمت بجالانے میں ان کو باک نہیں ہوتا۔ گزشتہ ڈیڑھ سو برس کا تجربہ بتاتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں ہی کی جماعت سے ایک دو نہیں سیکڑوں، ہزاروں خائن اور غدار انگریزوں کو مل گئے' جنھوں نے تقریر سے، تحریر سے، ہاتھ اور پاؤں سے حتیٰ کہ تلوار اور بندوق تک سے اپنے مذہب اور اپنی قوم کے مقابلے میں دشمنوں کی خدمت کی۔

جب ابا جان' جیل سے رہا ہو کر گھر آئے تو ہمارے ایک عزیز جو اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے' ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ لیے مبارک باد دینے آئے۔ اپنی عادت کے مطابق وہ چہک نہیں رہے تھے' بلکہ چپ چپ سے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد ہم لوگوں نے حیرانی سے کہا کہ 'آج یہ اتنے بجھے بجھے سے کیوں تھے؟' ابا جان نے اس کی وجہ بتائی: 'جماعت پر پابندی کے دوران' مقدمے کے سلسلے میں پولیس کی گاڑی میں مجھے ہائی کورٹ لایا جارہا تھا' سپرنٹنڈنٹ پولیس میرے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور گاڑی ہائی کورٹ کے گیٹ کی طرف مڑ رہی تھی۔ سامنے سے یہ صاحب اپنی گاڑی خود ڈرائیو کرتے ہوئے آرہے تھے۔ جوں ہی میری آنکھیں ان سے چار ہوئیں' غیرارادی طور پر میرا ہاتھ سلام کے لیے اٹھ گیا اور میں نے اشارے سے انھیں سلام کیا۔ اس بندۂ خدا نے میری طرف دیکھا ضرور' مگر جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئے۔ سلام کا جواب اس لیے نہ دیا کہ کہیں سپرنٹنڈنٹ پولیس نہ دیکھ لے۔ پھر ابا جان نے ہمیں سمجھایا: 'یہ بات میں نے آپ لوگوں کو اس لیے بتائی ہے کہ اس دنیا اور اس کی ڈھلتی پھرتی چھاؤں کی حقیقت کو سمجھیں۔ یاد رکھو' کہ ساری دوستیاں' رشتے داریاں اور محبتیں اسی وقت تک ہوتی ہیں جب آدمی کے حالات اچھے ہوں' جیسے ہی حالات بدلتے ہیں' ساری چاہتیں' دوستیاں اور رشتے داریاں دم توڑ دیتی ہیں'۔

اگر ابا جان ہمیں یہ بات نہ بھی بتاتے تو ہم کو اتنا تو تجربہ ہو چکا تھا کہ ہم کبھی کسی کے ظاہری التفات سے دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ جب ابا جان جیل سے باہر ہوتے تھے تو ہم مولانا

کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہوتے تھے اور جیسے ہی وہ جیل جاتے تھے، تو ایسا محسوس ہوتا کہ اس بھری دنیا میں، ہم تنہا ہیں۔ جوں ہی ابا جان جیل سے رہا ہو کر آتے تھے، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم پر جان چھڑکنے والے تو بہت زیادہ ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ہم خود آگے بڑھ کر کسی سے نہیں ملتے بلکہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ وہ ہم سے پہلے ملے اور اسی لیے لوگ ہمیں مغرور اور کم آمیز سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ابا جان کی وجہ سے لوگ دوسروں کے سامنے ہم سے آنکھ ملانا پسند نہیں کرتے تھے کہ خواہ مخواہ سروس ریکارڈ خراب ہو جائے گا، ترقی رک جائے گی اور پتا نہیں کہاں کہاں انکوائریاں ہوں گی۔ یہ خود کو سنبھال کر رکھنے اور ملنے میں پہل نہ کرنے کی عادت بچپن سے اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ اب بدلے نہیں بدلتی۔

گھر پر پولیس کا چھاپا

۱۹۶۶ء کی بات ہے، رمضان کا مہینہ اور تراویح کا وقت تھا۔ لوگ تراویح کے لیے جمع ہو رہے تھے کہ اچانک اچھرہ پولیس اسٹیشن سے تھانے دار، دو سپاہیوں کے ساتھ ہمارے گھر آیا اور پیغام دیا کہ مجھے مولانا صاحب سے ایک بہت ضروری بات بالکل تنہائی میں کرنی ہے۔ ابا جان نے اپنے دفتر میں بلوا لیا۔ تھانے دار نے سپاہیوں کو باہر چھوڑا اور اندر آ کر ابا جان سے کہا: 'مجھے 'اوپر' سے حکم ملا ہے کہ پولیس کی گارڈ لے کر جس میں زنانہ پولیس بھی ہو، مولانا مودودی کے گھر پہ چھاپہ مارو۔ ان کے گھر کے سرونٹ کوارٹر میں ایک اغوا شدہ لڑکی ہے، اسے برآمد کرو۔ فوٹوگرافروں سے اس کی تصویریں اترواؤ اور وہیں اخباری نمایندوں کو ساری تفصیلات سے آگاہ کرو!' یہ کہہ کر اس تھانے دار نے کہا: 'مولانا' مجھے آپ کی عزت اپنی عزت کی طرح پیاری ہے میں جلدی سے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ اپنے گھر کے سرونٹ کوارٹر کی تلاشی لے لیں اور اس لڑکی کو برآمد کر کے بھگا دیں۔ میں اب جا رہا ہوں اور بس پندرہ منٹ کے اندر اندر میں پولیس کی گارڈ، اخباری نمایندوں اور فوٹوگرافروں کے ساتھ آپ کے گھر آؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اور آپ کے بیٹوں کی عزت بچ جائے، کیونکہ الزام آپ کے کسی بیٹے پر لگے گا!'

ابا جان یہ سن کر اندر آئے اور ساری بات رازداری کے ساتھ اماں جان کو بتائی۔ کچھ

سن گن ہم لوگوں کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھی۔ اماں جان سرونٹ کوارٹر میں گئیں۔ نوکروں نے انھیں باتوں باتوں میں ٹال دیا کہ نہیں' بیگم صاحبہ ایسا کیسے ہوسکتا ہے' آخر ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ آپ کا اور میاں جی کا تو جہاں پسینہ گرے ہم اپنا خون بہانے کو تیار ہیں'۔

ادھر وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا کہ یکدم میرے بھائی حسین فاروق [پ: ۱۵ فروری ۱۹۴۵ء' دہلی] اور محمد فاروق سرونٹ کوارٹر میں گھس گئے اور جب تلاشی لی تو دیکھا کہ ہماری کھانا پکانے والی مائی کی ایک رشتے دار لڑکی وہاں موجود تھی۔ مائی اور اس لڑکی کو اسی وقت وہاں سے نکال باہر کیا اور بھگا دیا۔ گھر کے ایک گیٹ سے وہ دونوں باہر نکلیں اور دوسرے گیٹ سے پولیس کی گاڑیاں داخل ہوئیں۔ زنانہ پولیس نے اندر پورے گھر کی تلاشی لی اور مردانہ پولیس نے سرونٹ کوارٹر پر دھاوا بول دیا' لیکن وہاں کوئی لڑکی ہوتی تو برآمد ہوتی۔ یہ واقعہ ایوب خاں صاحب کے زمانۂ صدارت میں پیش آیا تھا۔

اس مایوس کن دور میں یہ مثال بڑی امید افزا تھی کہ اگر بڑے بڑے سرکاری افسر چاپلوس' خوشامدی اور ضمیر فروش ہیں تو کیا ہوا۔ اس قوم میں اچھرہ پولیس اسٹیشن کے تھانے دار جیسے دیانت دار اور دوسروں کی عزت کو اپنی عزت کی طرح عزیز رکھنے والے نایاب انسان بھی تو موجود ہیں۔ اگر کہیں اس نیک نفس پولیس افسر نے اپنی ترقی اور مستقبل کو خطرے میں ڈال کر اور اپنی سروس کو داؤں پر لگاتے ہوئے قبل از وقت ابا جان کو خبردار نہ کیا ہوتا تو دوسرے دن اخباروں میں کیسی کیسی سرخیاں جمائی جاتیں۔

اسی تھانے دار نے بتایا تھا کہ: مولانا' آپ کے کچھ ذاتی ملازم روز رات کو تھانے میں آکر پورے دن کی رپورٹ دیتے ہیں۔ جتنی تنخواہ آپ ان کو دیتے ہیں' اس سے کہیں زیادہ تنخواہ وہ تھانے سے لیتے ہیں'۔ یاد رہے کہ یہ وہی ملازمین تھے، جو میاں جی کے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کا دعویٰ کر رہے تھے۔ یہ اطلاع ملنے کے باوجود ابا جان نے گھر کے کسی نوکر کو فارغ نہیں کیا کہ جو نئے ملازم آئیں گے' وہ بھی انھی کی طرح تھانے میں رپورٹ دیں گے۔

ہم لوگ اس وقت اسکول کی تعلیم مکمل کر کے کالج میں پہنچ چکے تھے۔ تب' صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں کا اقتدار پورے عروج پر تھا۔ ابا جان کے خلاف پروپیگنڈا مہم زوروں پر تھی۔

اخبارات میں سرخیاں لگتیں کہ مولانا مودودی غدار ہیں' وہ پاکستان کے مخالف تھے۔ لاہور کالج برائے خواتین میں قدم رکھتے ہی کسی نہ کسی طرف سے یہ آوازے ضرور کسے جاتے: 'مردودی مردودی۔ ایک مودودی سو یہودی۔ ٹھاہ مودودی ٹھاہ' وغیرہ۔ بلاشبہ ہمارے لیے یہ باتیں سخت تکلیف دہ تھیں۔ تاہم' جب بھی ہم اس بات کا تذکرہ ابا جان سے کرتے' تو ان تکلیف دہ باتوں کے جواب میں وہ اکثر یہ شعر پڑھتے تھے:

در کوئے نیک نامی مارا گزر نہ دادند
گر تو نمی پسندی' تغیر کن قضا را

[نیک نامی کے کوچے میں تو ہمیں (وہ) قدم ہی نہیں رکھنے دیتے' اگر تجھے یہ بات پسند نہیں ہے تو تقدیر بدل دے۔]

ادھر ہماری اماں جان نے ہمیں سمجھا دیا تھا: 'اگر پڑھنا ہے تو انھی حالات میں اور انھی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھو ورنہ جاہل رہ جاؤ گے۔ اپنے آپ کو صبر اور حوصلے کا پہاڑ بنا لو کہ بڑے بڑے طوفان آ کر اس سے ٹکراتے ہیں' لیکن وہ اپنی جگہ نہیں چھوڑتا' وہیں کھڑا رہتا ہے۔ اپنے اندر سمندر جیسا ظرف پیدا کرلو کہ بڑے بڑے دریا آ کر اس میں گرتے ہیں' وہ انھیں اپنے اندر سمو لیتا ہے' لیکن کبھی کنارے توڑ کر باہر نہیں نکلتا'۔ 'بازار کی گالی ہنس کر ٹالی' کا اصول یاد رکھنا۔ ساتھ ہی اماں جان نے یہ بھی ہمیں اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ گالی کے جواب میں گالی کبھی نہ دینا۔ ان کا کہنا تھا: ایک چپ ہزار جواب ہے۔ گندے پانی میں اینٹ پھینکو گے تو اپنے کپڑوں پر چھینٹے پڑیں گے۔ اس لیے کبھی کسی کی سخت بات کا جواب نہ دینا۔

بہن بھائیوں میں سے صرف مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے ابا جان سے براہ راست بھی پڑھا ہے۔ میٹرک میں نے فارسی کے ساتھ کیا تھا۔ کالج میں پہنچ کر اماں جان نے مجھے لازمی مضمون کے طور پر عربی دلوا دی۔ عربی مجھے تھوڑی بہت اس لیے آتی تھی کہ قرآن شریف ترجمے سے پڑھا تھا۔ لہٰذا فرسٹ ایئر میں' میں نے اپنی تعلیمی ضروریات کے لیے ابا جان سے عربی پڑھی تھی۔ صورت یہ ہوتی کہ جس وقت دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد' وہ آرام کے لیے لیٹ جاتے تو میں اپنی کتابیں لے کر ان کے پاس بیٹھ جاتی تھی۔ تب انھوں نے مجھے عربی گرامر

اور متعلقہ اسباق پڑھائے۔ کچھ گردانیں بھی یاد کروائیں۔ اسی طرح مضمون اسلامیات میں سے سورۃ الاحزاب کا ترجمہ و تفسیر بھی میں نے انھی سے پڑھا۔

جب دوپہر یا رات کے وقت ابا جان کھانا کھانے کے لیے گھر کے اندر آتے تھے تو لکھتے لکھتے، قلم، کاغذات اور مسودات کو لکھنے کی میز پر اسی طرح چھوڑ دیتے تھے۔ تب اسکول کے زمانے میں، میں جلدی سے ان کے دفتر میں جا کر ان کے کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر پڑھتی تھی کہ وہ آج کل کیا لکھ رہے ہیں۔ چونکہ حافظہ اچھا تھا اس لیے ایک دو بار پڑھنے سے عبارت زبانی یاد ہو جاتی تھی، لیکن میری یہ سرگرمی کسی پر کھلی نہیں تھی۔ ایک دن کھانا کھاتے ہوئے کوئی بات چھڑی تو موقعے کی مناسبت سے مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے ابا جان کا لکھا ہوا ایک پیرا گراف انھی کے اسٹائل میں انھیں سنا دیا۔ یہ سن کر ابا جان تو دنگ رہ گئے اور مجھ سے پوچھا: 'ہائیں' اس کی ہوا تمھیں کیسے لگی؟ یہ تو میں نے ابھی کل رات کو لکھا ہے!' میں نے جواب دیا: 'میں تو روز آپ کے دفتر میں جا کر آپ کے کاغذات پڑھتی ہوں۔ مجھے سب معلوم ہے کہ آپ آج کل کیا لکھ رہے ہیں!'۔ ابا جان حیران و پریشان بڑی معصومیت سے میری طرف دیکھ کر کہہ رہے تھے: 'اچھا! اچھا!' لیکن مجھے پتا تھا کہ ابا جان اندر سے خوش تھے، اگرچہ بظاہر ناراضی ظاہر کر رہے تھے۔

اس واقعے کے چند روز بعد دادی اماں نے ابا جان سے کہا: 'اوپر کی منزل میں جن رہتا ہے!' ابا جان نے جواب دیا: 'اماں بی' آپ ایک جن کی بات کر رہی ہیں میں تو کہتا ہوں کہ یہاں نو جن رہتے ہیں اور ان جنات میں سے ایک قسم تو ایسی بھی ہے کہ وہ میرے کاغذات تک کو بخشنے کے لیے تیار نہیں۔ میری غیر موجودگی میں میرا لکھا ہوا پڑھا جاتا ہے اور یاد کر کے میرے ہی اسٹائل سے مجھ کو سنایا بھی جاتا ہے۔ یہاں تو ایسے ایسے جن ہیں، جو میرے قلم تک کے دربان بنے ہوئے ہیں۔ مجال ہے کہ زِیر زَبر کی بھی غلطی کر جائیں'۔

اس واقعے کے کئی برس بعد، جب میں گرمیوں کی چھٹیوں میں جدہ سے پاکستان آئی ہوئی تھی، اماں جان نے مجھے ایک درس میں اپنی جگہ بھیج دیا۔ وہ لاہور میں میرا پہلا درس تھا۔ بعد میں وہاں سے اماں جان کے پاس فون آیا: 'بیگم صاحبہ' آپ کی بیٹی نے بہت اچھا درس دیا ہے' ہمارا تو خیال تھا یہ لڑکی ایم اے انگلش ہے' انگریزی پڑھاتی ہے بھلا یہ کیا درس دے گی' بس بیگم صاحبہ

نے خانہ پری کے لیے اپنی بیٹی کو بھیج دیا ہے لیکن ہم تو حیران رہ گئے۔ واقعی قرآن وحدیث کی تعلیم تو آپ کے گھر کا ورثہ ہے'۔

جب یہ بات اباجان نے سنی تو مجھے بلا کر پوچھا: 'ذرا بتاؤ تو سہی' تم وہاں کیا گڑبڑ کر کے آئی ہو؟' میں نے جواب دیا: 'آپ کے جو پیراگراف میں نے اسکول کے زمانے سے یاد کر رکھے ہیں' بس وہی دہرا دیے' کچھ حدیثیں اور علامہ اقبالؒ کے کچھ اشعار یاد ہیں۔ باقی آپ کے پیراگراف مدد دیتے ہیں۔ اگر میں کہیں پھنس جاتی ہوں تو انھی کو ٹھونک کر کام چلا لیتی ہوں۔ آپ کے یہ اقتباسات لکھنے میں بھی کام دے جاتے ہیں اور درس میں بھی چل جاتے ہیں'۔

میں تو اپنی رو میں بولے جارہی تھی' ادھر اباجان دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑے سن رہے تھے اور حیران پریشان میری طرف دیکھے جارہے تھے۔ بعد میں اسما بہن نے مجھ سے کہا: 'اباجان سے ایسی باتیں صرف تم کرسکتی ہو!'

چونکہ میں نے تفہیم القرآن کا مطالعہ اس وقت کیا جب وہ لکھی جارہی تھی' اس لیے آج بھی ان حصوں کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ صاحب تفہیم القرآن لکھتے لکھتے قلم رکھ کر بس ابھی ابھی کہیں گئے ہیں' واپس آکر لکھنا شروع کر دیں گے! جیسے وہ اسی عالم ہست و بود میں موجود ہیں!

اباجان کے کردار کی ایک خوبی جو مجھے بہت زیادہ یاد آتی ہے' یہ ہے کہ بلا مبالغہ وہ اپنے بچوں کی اتنی عزت کیا کرتے تھے جتنی دوسرے لوگ ماں باپ کی کرتے ہیں۔ عام حالات میں وہ ہمیں 'بیٹی' کہا کرتے تھے۔ ذرا رنجیدہ ہوتے تو 'صاحبزادی' کہا کرتے' اور اگر بہت ہی زیادہ ناراض ہوتے تو پھر 'صاحبزادی صاحبہ' کہتے۔ پکارنے کا یہ انداز ہی ہمارے لیے ایک تازیانہ ہوتا تھا' اور ہماری کوشش ہوتی کہ 'صاحبزادی صاحبہ' کہنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

گالیاں

میری بیٹی رابعہ [پ: ۲۱ جنوری ۱۹۶۷ء' لاہور] سے اباجان بہت پیار کرتے تھے۔ یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ ایک روز ہم اسے لے کر خریداری کے لیے انارکلی بازار گئے' تو سامنے

سے پیپلز پارٹی کا جلوس آ گیا۔ جلوس میں ابا جان کو گالیاں دی جارہی تھیں۔ ہم یہ دیکھ کر فوراً واپس گھر آ گئے۔ دوپہر کو جب ابا جان کھانا کھانے گھر میں آئے تو ان کے بالکل برابر والی کرسی پر بیٹھ کر بیٹی رابعہ نے غور سے ان کا چہرہ دیکھا اور پوچھا: 'نانا ابا' مولانا مودودی آپ ہی ہیں نا؟' کہنے لگے: 'ہاں' بیٹی میں ہی ہوں'۔

اس پر رابعہ بولی: 'نانا ابا' انارکلی میں تو مولانا مودودی کو گالیاں دی جارہی تھیں'۔ نواسی کی یہ بات سن کر ابا جان گویا باغ باغ ہو گئے اور مسکرا کر پوچھنے لگے: 'اچھا' آپ نے سنی تھیں'۔ اس پر میں نے ڈانٹ کر رابعہ کو چپ کرایا اور ابا جان سے کہا: 'آپ خوش تو ایسے ہو رہے ہیں جیسے گالیاں نہیں' بلکہ آپ کو کوئی خزانہ مل گیا ہے'۔ میری یہ بات سن کر ابا جان ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے: 'بیٹی' میں نے تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ابھی صرف گالیاں ہی کھائی ہیں پیغمبروں اور اللہ کے نیکوکار لوگوں نے تو پتھر بھی کھائے ہیں۔ یہ اللہ کی راہ کی گالیاں ہیں اور یہ انبیا کی سنت ہیں۔ یہ ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہیں'۔

ایک مرتبہ ایک صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے۔ انھوں نے ابا جان کو ایک غیر ملکی ساخت کا قلم دیا اور کہا: 'یہ ایک تحفہ ہے جو ایک روسی باشندے نے آپ کو بھجوایا ہے'۔ معلوم ہوا کہ وہ صاحب چند ماہ پیش تر تاشقند گئے تھے' وہاں ایک ممتاز مقامی باشندے نے علاحدگی میں انھیں بتایا کہ 'میں مسلمان ہوں!' اور پھر اس نے وہ قلم انھیں دیا اور فرمایش کی کہ پاکستان جا کر وہ اس قلم کو ابا جان تک پہنچا دیں۔

۱۹۶۸ء میں بھٹو صاحب [م: اپریل ۱۹۷۹ء] نے طالب علموں کو کالجوں سے نکالا اور سڑکوں پر لا کر مظاہرے کروائے۔ اسی طرح مزدوروں کو فیکٹریوں سے نکال کر سڑکوں پر نعرے لگوائے۔ اس صورت حال پر ابا جان نے دل گرفتہ ہو کر کہا کہ: 'ایک بار طالب علموں کو کلاسوں سے اٹھا کر سڑکوں پر لانا اور ان سے نعرے لگوا کر مظاہرے کروانا آسان ہے۔ کل جب آپ چاہیں گے کہ یہ بچے دوبارہ کلاسوں میں بیٹھ کر پڑھنے لگیں تو یہ ناممکن ہے۔ اس جن کو بوتل ہی میں رہنے دیں۔ یہ ایک بار بوتل سے باہر نکل آیا تو دوبارہ اسے بوتل میں بند کرنا ناممکنات میں سے ہوگا۔ اسی طرح مزدوروں کو ایک بار فیکٹریوں اور کارخانوں سے نکال کر ان سے سڑکوں پر نعرے

لگوانا اور مظاہرے کروانا آسان ہے۔ کل جب آپ چاہیں گے کہ یہی مزدور پھر کارخانوں میں جائیں اور کام کریں تو یہ ناممکن ہو جائے گا۔ اباجان نے اپیل کی کہ خدارا قوم کے مزاج میں ہلڑبازی کو مت داخل کیجیے۔ اس سے تعلیم اور صنعت و حرفت کا جنازہ نکل جائے گا۔ لیکن اسی زمانے میں قوم کے مزاج میں ایسی ہلڑبازی داخل ہوئی' جو آج ہر طرف نظر آ رہی ہے۔

اباجان ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ انھوں نے اس قدر سنجیدہ کام کیا جو دوسرے لوگوں کے نزدیک خشک اور بوجھل ہوتا' مگر وہ اپنی زندگی میں نہایت باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان تمام حوالوں سے میرے آئیڈیل میرے اباجان تھے۔

ہم نے گھر میں اباجان کو دکھ اور سکھ ہر حال میں دیکھا ہے۔ لیکن تین مواقع ایسے ہیں' جب اباجان پر دکھ کی شدت کو پوری طرح عیاں حالت میں دیکھا:

- اگست ۱۹۴۷ء کے بعد وہ وقت کہ' جب بے سہارا اور لٹی پٹی مسلمان عورتوں کے تذکرے انھوں نے براہِ راست سنے اور ایسی مجبور و مظلوم لڑکیوں کی حالت زار انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی۔
- دوسرا موقع وہ تھا' جب [۲۵ اگست] ۱۹۶۶ء میں سید قطبؒ کو مصر کے صدر ناصر [م: ستمبر ۱۹۷۰ء] نے پھانسی دی تھی۔
- اور تیسرا موقع تھا' دسمبر ۱۹۷۱ء میں سقوطِ ڈھاکہ کا۔ اس تیسرے سانحے سے اباجان کے دل پر کیا گزری؟ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں دل کا پہلا دورہ اسی حادثے کے چند روز بعد پڑا تھا۔ وہ کہتے تھے: 'سقوط ڈھاکہ ایک ملک کا سقوط نہیں بلکہ ایک اُمت اور ایک نظریے کا سقوط ہے۔ مشرقی پاکستان کبھی الگ نہ ہوتا' مگر یوں سمجھیے کہ مغربی پاکستان کے مقتدر طبقوں نے اسے دھکے دے دے کر الگ کیا ہے۔

فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی تو سعودی عرب کے فرماں روا شاہ فیصل بن عبدالعزیز [م: ۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء] نے خاص طور پر اباجان کے بارے میں پوچھا' اسی لیے آخری وقت میں بھٹو صاحب نے انھیں کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ

بھیجا۔ کانفرنس شروع ہوئی اور ابا جان ابھی کانفرنس ہال (پنجاب اسمبلی ہال) کی سیڑھیوں پر قدم رکھ ہی رہے تھے تو انھیں معلوم ہوا کہ اس کانفرنس میں شیخ مجیب الرحمٰن کے سامنے بھٹو صاحب بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کرنے والے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ انھی قدموں پر ابا جان یہ کہتے ہوئے واپس گھر چلے آئے کہ: 'جس شیخ مجیب نے پاکستان توڑنے کی سازش میں ایک مہرے کے طور پر کام کیا ہے' اس کے ساتھ بیٹھنا میرے لیے ممکن نہیں ہے اور میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا' کہ میرے سامنے بنگلہ دیش منظور کرنے کے لیے ہاتھ اٹھیں'۔

تفہیم القرآن کی تکمیل

۷ جون ۱۹۷۲ء میں تفہیم القرآن کی آخری اور چھٹی جلد مکمل ہوئی۔ تفہیم کی تکمیل کی مناسبت سے جون ۱۹۷۲ء کے آخری دنوں میں فلیٹیز ہوٹل لاہور میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ جس میں اے کے بروہی صاحب [م: ۱۳ ستمبر ۱۹۸۷ء] نے کہا: 'مولانا مودودی کی تفہیم القرآن اور ان کے لٹریچر نے لاکھوں مغرب زدہ نوجوانوں کو اسلام کی روح سے آشنا کیا ہے اور ان کی زندگیوں میں انقلاب برپا کیا ہے'۔ بروہی صاحب نے مزید کہا: 'انسان کی سب سے قیمتی متاع اس کی سیرت و کردار ہے اور اگر کسی آدمی کی سیرت و کردار کو تبدیل کرنا اور اس میں کوئی قابلِ قدر تغیر برپا کر دینا ممکن ہے' تو جو شخص یہ کام سرانجام دیتا ہے وہ اس آدمی کی زندگی کا معمار ہوتا ہے' سیرت ساز ہوتا ہے اور اس نقطۂ نظر سے میری رائے میں آج پاکستان کے سب سے عظیم انسان مولانا مودودی ہیں۔ میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ اگر آج یہ سوال اٹھایا جائے کہ کون سا فرد ہے، جس نے پاکستان کے لوگوں کے کردار کو سب سے زیادہ مثبت طور پر متاثر کیا تو میرا جواب ہوگا کہ وہ مولانا مودودی ہیں۔ اگر روزِ قیامت اللہ تعالیٰ نے مجھ سے گواہی طلب فرمائی تو میں اس وقت بھی یہی گواہی دوں گا، جواب دے رہا ہوں'۔ محفل کے دیگر شرکا نے بھی ابا جان کی دینی خدمات پر عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ اور جب ابا جان کی باری آئی تو انھوں نے نہایت عاجزی اور انکسار سے کہا: 'اگر دنیا بھر میں کسی کام کو قبولیت حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ نامقبول ہو جائے تو کچھ حاصل نہیں' لیکن دنیا میں اگر مقبولیت حاصل نہ ہو اور اللہ کے ہاں وہ مقبول ہو جائے تو یہی اصل کامیابی ہے۔ میں دعا کرتا ہوں اور آپ بھی دعا کریں

کہ اللہ تعالیٰ میری اس ناچیز خدمت کو قبول فرمائے اور اگر یہ کتاب کسی ایک بندہ خدا کی ہدایت کا بھی ذریعہ بنے تو اسے میری مغفرت کا ذریعہ بنائے'۔

پھر فرمایا: 'بندہ اپنے رب کے حضور عاجزی کے ساتھ چند اوراق لیے کھڑا ہے کہ یہ تفسیر، تفہیم، حق کے لیے ہے اور یہ زندگی شہادتِ حق کے سوا کسی اور کام کے لیے وقف نہیں رہی اور یہ خدا ہی ہے، جو اپنے بندوں کو اس کی توفیق دیتا ہے'۔

ابا جان نے تزکیہ نفس، شہادتِ حق اور اقامت دین کی ہمہ گیر جدوجہد کے لیے چومکھی لڑائی لڑی، جس میں: • ایک طرف اصحاب اقتدار کا گروہ تھا، جو پوری انتظامی مشینری کو ان کے خلاف استعمال کررہا تھا۔ • دوسری طرف سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام اپنی دولت وسطوت کے ساتھ ان کا مدمقابل تھا۔ • تیسری طرف انھیں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے اخلاق سے گرے پروپیگنڈے کا مقابلہ کرنا پڑا۔ • چوتھی طرف مذہبی پیشواؤں کا طبقہ تھا، جن کو ابا جان کے مشن کی کامیابی کے نتیجے میں اپنی مذہبی اجارہ داری ڈانواں ڈول ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ • پانچویں طرف قادیانی حضرات تھے، جو انتہائی ذلیل اور رکیک دشنام طرازیوں پر اتر آئے تھے۔ • چھٹی جانب مستشرقین اور ان کے ہم نوا منکرین حدیث کا گروہ تھا، جنھوں نے اسلام، قرآن اور صاحبِ قرآن کے بارے میں مخالفانہ پروپیگنڈا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اس طرح یہ معرکہ بہت سے محاذوں پر جاری رہا۔ کمزور صحت اور مسلسل بیماری کے باوجود انھوں نے تن تنہا وہ کام کیا جو کئی اداروں اور کئی جماعتوں کے کرنے کا کام تھا۔

وہ بیک وقت ایک جید عالمِ دین بھی تھے اور ریسرچ اسکالر بھی، مفسر بھی تھے اور مفکر بھی، مورخ بھی تھے اور مبلغ وخطیب بھی، ایک دانش ور بھی تھے اور صحافی وادیب بھی اور اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ ایک بالغ نظر سیاست دان بھی۔

۱۹۷۷ء میں، پیپلز پارٹی کی حکومت نے عام انتخابات [۷ مارچ] میں دھاندلی کی، جس کے خلاف 'پاکستان قومی اتحاد' میں شامل پارٹیوں نے مارچ سے جولائی کے دوران میں بھٹو حکومت کی برطرفی کے لیے ملک گیر مہم چلائی۔ ابا جان نے ۱۲ اپریل کو وزیراعظم بھٹو صاحب کے سامنے تجویز پیش کی کہ: 'وہ ان متنازع انتخابات کو کالعدم قرار دے کر دوبارہ انتخابات کرانے پر

آمادہ ہو جائیں‘۔ لیکن انھوں نے اس زعم میں کہ ’میری کرسی مضبوط ہے‘ عوام پر لاٹھیاں اور گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ آخر کار وسط اپریل میں وہ ابا جان سے ملنے کے لیے ہمارے گھر اچھرہ آئے۔ اس موقعے پر بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے اور انھوں نے بھٹو صاحب کے خلاف مخالفانہ نعرے بازی شروع کر دی، جس پر ابا جان نے لوگوں سے اپیل کی کہ: ’بھٹو صاحب میرے مہمان ہیں‘ ان کی عزت میری عزت ہے اس لیے یہ نعرے بازی بند کی جائے‘۔ ملاقات میں وہ کہنے لگے: ’مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ آپ کو سادہ کاغذ پر دستخط کر کے دینے کو تیار ہوں‘ جو شرائط چاہیں آپ عائد کر دیں‘ مجھے منظور ہیں‘۔

ابا جان کا جواب تھا: ’آپ استعفا لکھ دیں‘ کیونکہ آپ اس قدر آگے جا چکے ہیں کہ استعفے سے کم پر قوم مطمئن نہیں ہو سکتی۔ پھر منصفانہ انتخاب میں آپ کامیاب ہو کر دوبارہ آجائیں‘ لیکن موجودہ صورت میں اس کے علاوہ کوئی حل نہیں‘۔

۴۵ منٹ کی اس گفتگو میں زیادہ تر بھٹو صاحب ہی بولتے رہے۔ کبھی کہا کہ افغانستان کے حالات یہ ہیں‘ انڈیا میں یہ ہو رہا ہے‘ بلوچستان میں بے اطمینانی ہے‘ ایران کے حالات خراب ہو سکتے ہیں‘ اس صورت حال میں قوم کو میری ضرورت ہے۔

یہ کہہ کر بھٹو صاحب نے پھر پوچھا: ’آپ بتائیں کہ میں کیا کروں؟‘

ابا جان کا جواب تھا: ’ان تمام حالات کا بھی یہی تقاضا ہے کہ آپ استعفا دیں‘ پھر غیر جانب دارانہ اور شفاف انتخابات کرائیں۔ اگر آپ کو اعتماد کا ووٹ ملے تو حکومت میں آئیں۔ اسی سے آپ کے اقتدار کا اخلاقی جواز پیدا ہوگا‘ اسی میں ملک و قوم کا مفاد پوشیدہ ہے اور آپ بھی اسی سے مضبوط ہو سکتے ہیں۔ آپ کے بیان کردہ تمام داخلی اور خارجی خطرات سے نمٹنے کا یہی واحد راستہ ہے‘۔ مگر بھٹو صاحب اس طرف آتے ہی نہیں تھے۔

پھر انھوں نے اپنی قومی خدمات کا تذکرہ شروع کر دیا‘ جس پر ابا جان نے کہا: ’آپ کی خدمات سے انکار نہیں ہے‘ لیکن جو چیز غلط ہے‘ اس کا مداوا خدمات کے تذکرے سے ممکن نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ قوم کسی بڑی تباہی سے دوچار ہو۔ اسی لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ سے مل کر یہ بات کہہ دوں۔ مجھے خطرہ ہے کہ جو لوگ آج سڑکوں پر آپ کے استعفے کی بات کر رہے ہیں‘ آنے والے کل کہیں اس سے آگے کا مطالبہ نہ شروع کر دیں اور اگر یہ بحران بڑھ گیا تو

پھر بدقسمتی سے مارشل لا کا خطرہ بھی خارج از مکان نہیں' اور مارشل لا خود تباہی کا پیش خیمہ ہوگا'۔

اس ملاقات کے کچھ ہی دیر بعد' ابا جان نے پریس کانفرنس میں گفتگو کی تفصیلات بیان کیں۔ مگر صرف سات روز بعد بھٹو صاحب نے خود لاہور' کراچی اور حیدرآباد میں مارشل لا نافذ کر کے فوج کا راستا صاف کر دیا۔

ابا جان کی عادت تھی کہ وہ 'بڑے لوگوں' سے ذرہ برابر بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے' بلکہ ہمیں نصیحت کیا کرتے تھے: 'آدمی کو بحیثیت انسان دیکھنا چاہیے۔ اس کے گھر' اس کی سواری یا اس کے لباس کو دیکھ کر اس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے' اور یہ جو بڑے بڑے شان دار گھر ہوتے ہیں' یہ مردہ خانے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ جو فرد کسی بڑے گھر میں رہتا ہے اس کا کردار بھی عظیم ہو'۔

ایک مرتبہ سعودی فرماں روا شاہ فیصل بن عبدالعزیز نے ابا جان کو پیش کش کی تھی: 'آپ میرے مشیر بن جایئے اور سعودی نیشنل ہونا قبول کر لیجیے'۔ ابا جان نے جواب میں کہا تھا: 'میں دینی جذبے اور اپنی پاکستانی قومیت کے ساتھ یہاں لاہور میں بیٹھا ہوا آپ کا ہمہ وقتی مشیر ہوں۔ آپ جب چاہیں' اپنے سفیر کے ذریعے یا براہِ راست مجھ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ جو کھری رائے ہوگی وہ دوں گا۔ البتہ اگر آپ کی رعایا بن کر آپ کی نوکری قبول کر لی تو پھر شاید صحیح مشورہ نہ دے سکوں گا ع

نازک مزاج شاہاں' تابِ سخن ندارند

اسی طرح ۱۹۷۴ء کی ایک شام' ابا جان کے پاس اردن کے فرماں روا شاہ حسین بن طلال [م: ۲۰۰۰ء] کا فون آیا تھا۔ جب ہم نے پوچھا کہ شاہ حسین نے آپ سے کیا بات کی تھی؟ تو ابا جان نے بڑی بے نیازی سے کہا تھا: 'ایسے لوگ اس قابل نہیں ہوتے کہ انھیں زیادہ اہمیت دی جائے۔ یہ لوگ باتیں تو بڑی لچھے دار کرتے ہیں' لیکن یہ اسی وقت تک ہوتا ہے' جب تک ان کے مفاد پر ضرب نہ پڑے' اور اگر کہیں ان کے یا ان کی اولاد کے مفاد پر ذرہ برابر بھی زد پڑ جائے تو یہ لوگ صابن کے جھاگ کے مانند بیٹھ جاتے ہیں'۔ پھر قدرے توقف کے بعد فرمایا: 'اصل قیمتی انسان وہ ہوتے ہیں' جو اللہ تعالیٰ کے دین کے وفادار ہوں اور اس کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔ جو آپ کے منہ پر تنقید کر سکیں اور پیٹھ پیچھے آپ کا دفاع کریں' ایسے لوگ ہی قدردانی کے حق دار ہوتے ہیں۔

جب میں کلیة التربیة للبنات (سعودی کالج براے خواتین) ریاض میں پڑھاتی تھی تو ایک سعودی لیکچرار خاتون نے مجھے جتایا: 'میں سعودی نیشنل ہوں اور باہر سے آئے ہوئے غیر سعودی اجانب (اجنبی) میرا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ میں نے اسٹاف میٹنگ ہی میں ان کی اطلاع کے لیے عرض کیا: آپ کے شاہ فیصل نے میرے والد کو سعودی شہریت کے ساتھ اپنی مشاورت کا منصب بھی پیش کیا تھا، مگر میرے والد صاحب نے یہ پیش کش قبول نہیں کی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ مناصب جن کے پیچھے لوگ بھاگتے پھرتے ہیں، ابا جان کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے، لیکن انھوں نے کبھی قبول نہیں کیے۔ اس طرح میں نے اس سعودی خاتون پر واضح کر دیا کہ میں اس شخص کی بیٹی ہوں، جسے مناصب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یاد رہے جب یہ مکالمہ ہوا، تب شاہ فیصل بقید حیات تھے۔

اخوان المسلمون کے دوسرے مرشد عام شیخ حسن الہضیبی [م: ۱۹۷۳ء] کی صاحبزادی جو کالج کے شعبہ نباتیات (Botany) کی صدر شعبہ تھیں، میٹنگ کے بعد، خاص طور پر میرے پاس آئیں اور کہا: 'تم واقعی اس قدر عظیم باپ کی بیٹی ہو۔ انھوں نے مجھے حضرت علیؓ کا قول سنایا: دنیا کی حقیقت یہ ہے کہ تم اس کو لات مارو تو یہ تمھارے قدموں میں آکر گرے گی۔ اس واقعے کے بعد سعودی عرب کے پورے قیام کے دوران مجھے غیر سعودی ہونے کا طعنہ دینے کی کسی کو جرأت نہ ہوئی۔

شاہ فیصل مرحوم کو ابا جان نے ایک اور اہم مشورہ بھی دیا تھا۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر شاہ فیصل اس پر عمل کر لیتے تو آج عالم اسلام کے حالات کچھ مختلف ہوتے۔

ابا جان نے شاہ فیصل سے بالمشافہ گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا: 'جس طرح امریکا نے ڈالر کے بل پر ساری دنیا کے اعلیٰ ترین دماغ کھینچ کر اپنے ملک میں جمع کر لیے ہیں اور وہ ملک جو صرف پانچ سو برس پہلے دریافت ہوا تھا، اسے بے مثال ترقی دی ہے، اسی طرح آپ ریال کے بل پر، جن کی آپ کے پاس کوئی کمی نہیں ہے اور نہ رقبے کی آپ کے ملک میں کمی ہے، عالم اسلام کے اعلیٰ ترین دماغ کھینچ کر اپنے ملک میں جمع کر سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ایسے عالی دماغ ڈاکٹروں، سائنس دانوں، ماہرین سماجی علوم اور بلند پایہ محققین کو آپ سعودی عرب کی شہریت اور بنیادی حقوق بھی دیجیے۔ پھر آپ دیکھیے گا کہ سعودی عرب کو سماجی، علمی، صنعتی، معاشی، دفاعی امور

سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں کس قدر عروج نصیب ہوتا ہے اور یہ عروج صرف سعودی عرب کا عروج نہیں ہوگا بلکہ پورے عالم اسلام کا عروج ہوگا'۔ جواب میں شاہ فیصل مرحوم نے فرمایا: 'میں ریال کے بل پر سارے عالم اسلام کے بہترین دماغ تو سعودی عرب میں جمع کرلوں اور انھیں شہریت سمیت حقوق بھی دے دوں' لیکن پھر میرے ہم وطن بدوؤ بکریاں لے کر اور اونٹوں پر سوار ہو کر واپس خیموں میں چلے جائیں گے اور صحراؤں میں ایسے گم ہوں گے کہ ان کا نشان بھی کسی کو نہیں ملے گا۔

افسوس کہ شاہ فیصل مرحوم کے بعد کے زمانے میں بھی خلیجی حکمرانوں نے زیادہ دُور اندیشی سے کام نہ لیا۔ انجام کار تیل اور ریال کی ساری دولت' بڑی بڑی مہنگی گاڑیوں' پر تعیش محلات یا مغرب کے بنکوں میں غرق ہو کر رہ گئی ہے۔ دفاع کا ذمے دار امریکا اور معیشت کی باگ ڈور مغربی ماہرین کے ہاتھ میں ہے۔

ابا جان مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ دین اس وقت تک غالب نہیں آسکتا، جب تک کہ یہ اُمت' صحابہ کرامؓ کی وہ صفت اپنے اندر پیدا نہ کرلے' جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے اور جس کی پیش گوئی تورات میں وارد ہوئی ہے' یعنی:

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ز سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ ج (الفتح ۲۹:)

[اور جو لوگ نبی کریمؐ کے ساتھ ہیں' وہ] کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں۔ تم جب دیکھو گے' انھیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور اس کی خوش نودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے۔ سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں' جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں۔

کم و بیش موجودہ مسلم ممالک کے تمام سربراہان کا حال یہ ہے کہ کفار کو دیکھتے ہی ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور ان کے آگے بچھے چلے جاتے ہیں اور جب مسلمانوں سے ملاقات ہوتی ہے تو آنکھیں پیشانیوں پر رکھ لیتے ہیں!

ایک جگہ ابا جان نے لکھا ہے: 'خدا کی شریعت بہادر شیروں کے لیے اتری ہے، جو ہوا

کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں ـــــ جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے محبوب رکھتے ہوں اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں ـــــ مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستے پر رواں کر دے، جو اس کے ایمان واعتقاد میں راہ راست ہے ـــــ صراط مستقیم ہے!'

لاہور آمد پر ایک بار میں نے ابا جان سے شکایت کی تھی: 'سعودی عرب میں انگریزی کا نصاب نہایت لچر اور فضول ہے' مصری اور پاکستانی اساتذہ تو اور زیادہ نمک مرچ لگا کر اسے فحش بنا دیتے ہیں۔ اس پر ابا جان نے استاد کے منصب اور بطور خاص ایک تحریکی استاد کی ذمے داریوں کے حوالے سے مجھ کو ہدایت کرتے ہوئے کہا:

'ایک نصاب وہ ہوتا ہے، جو نصابی کتب میں لکھا ہوا ہوتا ہے اور ایک وہ ہوتا ہے، جو استاد کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اصل اہمیت اس نصاب کی ہے، جو خود استاد کے ذہن میں ہوتا ہے۔ اپنے دین سے لگن رکھنے والا استاد تو گیتا سے بھی قرآن پڑھا سکتا ہے'۔ پھر کہنے لگے: 'مجبوری میں ملنے والا بدترین نصاب بھی اگر صحیح طریقے کے ساتھ پڑھایا جائے تو وہ طالب علموں کی اصلاح کا باعث بن سکتا ہے'۔

ایک خواب کی تعبیر

۱۹۷۸ء میں' میں جدہ سے گرمیوں کی تعطیلات کے سلسلے میں لاہور آئی ہوئی تھی کہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز مغرب کے بعد پاکستان ایئر فورس کے دو اسکواڈرن لیڈر سرگودھا سے ابا جان سے ملنے آئے۔ ابا جان دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے' وہیں انھیں بلوا لیا۔ ان میں سے ایک صاحب جو دیکھنے میں بڑے مضطرب نظر آ رہے تھے۔ یوں گویا ہوئے: 'مولانا! میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور جب سے دیکھا ہے میں اس قدر بے چین اور بے کل ہوں کہ نہ مجھے نیند آتی ہے' نہ بھوک لگتی ہے اور نہ میں کسی کام کو دل جمعی سے کر سکتا ہوں۔ وہ خواب یہ ہے کہ میں مدینے گیا ہوں' تو دیکھتا ہوں کہ مدینہ تو پورے کا پورا بم باری سے تباہ ہو چکا ہے۔ نہ مسجد ہے نہ گنبدِ خضرا ہے' نہ کوئی گھر اور عمارت سلامت ہے' اینٹ سے اینٹ بج چکی ہے۔ جب میں اس مقام پر آتا ہوں جہاں روضۂ مبارک ہے تو دیکھتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کچی

قبر کے باہر کھڑے نماز پڑھ رہے ہیں۔ کہیں قریب ہی سے بہت سے لوگوں کی باتیں کرنے کی آواز آتی ہے۔ میں ادھر دیکھتا ہوں تو ایک تہہ خانے میں سیڑھیاں اترتی نظر آتی ہیں۔ میں فوراً نیچے تہہ خانے میں چلا جاتا ہوں۔ ابھی آدھی سیڑھیاں ہی اترا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ چھ سات یہودی صرف جانگیے پہنے بڑے بڑے چھرے ہاتھوں میں لیے انسانی لاشوں کے ٹکڑے کرکر کے ڈھیر لگا رہے ہیں اور دیواروں سے بے شمار انسانی لاشیں لٹکی ہوئی ہیں۔ (یعنی اہلِ مدینہ کی) میں یہ منظر دیکھ کر الٹے پاؤں اوپر کی طرف بھاگتا ہوں کہ یہ تو میرے بھی ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ اوپر پہنچ کر دیکھتا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم التحیات پڑھ کر سلام پھیر رہے ہیں۔ سلام پھیر کر میری طرف دیکھ کر آپؐ فرماتے ہیں: 'فکر نہ کرو، یہ گوشت بکے گا نہیں!' اور پھر فوراً ہی میری آنکھ کھل گئی۔ بس مولانا جب سے میں نے یہ خواب دیکھا ہے، روز بروز میری بے کلی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے؟ آپ بتائیے، اس خواب کی تعبیر کیا ہے؟'

اگر چہ ابا جان، خوابوں کی دنیا سے تعلق نہیں رکھتے تھے اور نہ خوابوں کی تعبیر سے دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ حقائق کی دنیا اور منطقی اصولوں کو ایمان کے تابع لا کر زندگی بسر کرنے کے داعی تھے۔ لیکن اس کے باوجود یہ خواب سن کر ابا جان خود حیران ہوتے جا رہے تھے کہ ایسا خواب تو بڑے بڑے ولیوں کو بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوتا، مگر یہ اس داڑھی مُنڈے نوجوان ہوا باز کو نظر آیا ہے۔ کسی آستانۂ عالیہ کے سجادہ نشین، کسی فقیہِ مصلحت بیں اور کسی حاملِ جبّہ و دستار کو نہیں بلکہ ستاروں پہ کمند ڈالنے والے فضائیہ کے مجاہد کو دکھائی دیا ہے، جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں خانقاہوں اور حجروں کے باسیوں کی بجائے، رسمِ شبیری ادا کرنے والے ایسے نوجوان ہی ملتِ بیضا کی قیادت کریں گے اور یہی لوگ حرمین الشریفین کی حفاظت و مدافعت کی ذمے داری نبھائیں گے۔

ابا جان نے اُن نوجوان جنگی ہوا بازوں سے کہا: 'رسول کریمؐ کی حدیث مبارکہ جسے حضرت ابی ہریرہؓ [م: ۶۷۸ء] نے روایت کیا ہے: اِذَا وَقَعَتِ الملاحِمُ بَعَثَ اللّٰهَ بَعثًا مِنَ الموَالِی هُم اَکرمُ الْعَرَبِ فَرَسًا وَاجودُ سَلَاحًا یُؤیِّدُ اللّٰهُ بِهِمُ الدین (مشکوٰۃ) (جب جنگوں پر جنگیں ہوں گی، تو اللہ، غیر عرب اقوام میں سے ایک قوم کو اٹھا کر کھڑا کرے گا۔ وہ

شہسواری میں عربوں سے بہتر اور اسلحے میں ان سے برتر ہوں گے۔ ان کے ذریعے اللہ اپنے دین کی مدد کرے گا‘‘۔

پھر کہا: ’یہ خواب اس حدیث کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے جو حضرت عبداللہ بن عمروؓ [م: ۶۹۲ء] سے مروی ہے: [آخر زمانے میں] ایسے لوگ آئیں گے جو پرندوں کی طرح تیز رفتار اور درندوں کی طرح ظالم ہوں گے۔ یعنی آج ہمیں اس کا یہی مطلب سمجھ میں آتا ہے کہ جنگی ہوائی جہازوں پر سوار ہوکر اپنے ملک سے اڑیں گے اور بڑی بے رحمی سے اپنے مخالفوں کے بچوں‘ بوڑھوں‘ عورتوں اور مخلوقِ خدا کو تباہ و برباد کرتے جائیں گے‘ ان کے ہاتھوں نہ کسی کی جان و مال محفوظ ہوگی اور نہ عزت و آبرو!‘ تیسری حدیث مبارکہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاریؓ [م: ۶۵۲ء] کو مخاطب کر کے فرمایا: اے ابوذر‘ جس وقت مدینے میں ایسی بھوک ہوگی کہ تو اپنے بستر سے کھڑے ہوکر مسجد تک نہیں جاسکے گا‘ مگر یہ بھوک تجھ کو مشقت میں ڈال دے گی۔ اس وقت تیرا کیا حال ہوگا جب مدینے میں اتنا قتل ہوگا کہ خون احجار الزیت (چکنے پہاڑ) کو ڈھانپ لے گا۔

اسی طرح حدیث دجال سنا کر کہا: ’آپ کا خواب اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ آیندہ صلیب و ہلال کے معرکوں میں ایئر فورس فیصلہ کن کردار ادا کرے گی‘ اسی لیے اللہ نے یہ خواب ایک جنگی پائلٹ کو دکھایا ہے۔ اس لیے یہ وقت اپنے طیارے کے کاک پٹ میں اذان دینے کا ہے۔ آپ کا فرض آپ کو پکار رہا ہے‘ ملتِ بیضا اور حرمین الشریفین کی حفاظت اب آپ کی ذمے داری ہے۔ ایک حدیث کے مطابق حضرت عیسٰیؑ کے نزول کے بعد انھی علاقوں سے فوج ان کی مدد کو پہنچے گی، جو غیر عرب ہوں گے اور اسلحہ و فن سپہ گری میں عربوں سے افضل ہوں گے۔ یاد رکھیے‘ آپ کی سب سے بنیادی وفاداری اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے‘ اس کے بعد حرمین سے ہے اور اس کے بعد اپنے وطن سے۔ آپ ان وفاداریوں کو بیک وقت نبھانے کے لیے اللہ اور قرآن سے تعلق جوڑیں اور اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کی دعا کرتے رہا کریں‘۔

یہ تعبیر سننے کے بعد جب وہ پائلٹ پُرسکون ہوکر جانے کے لیے اٹھے تو بیماری اور سخت نقاہت کے باوجود‘ اباجان نے کھڑے ہوکر ان سے الوداعی مصافحہ کیا اور اصرار کر کے انھیں اپنے

کمرے کے دروازے تک رخصت کرنے آئے اور کہا: 'چونکہ آپ نے خواب میں نبی کریمؐ کی زیارت کی ہے' اس لیے آپ بھی تکریم کے لائق ہیں۔ اب آپ اپنی جو بے چینی اور بے کلی مجھے دے کر جا رہے ہیں' نہ جانے میں کب تک اس کیفیت میں مبتلا رہوں گا'۔

اس روز جب ابا جان رات کو کھانا کھانے اندرونِ خانہ آئے تو ان کے چہرے پر خلافِ معمول شدید اضطراب کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ انھوں نے جب یہ خواب اور اپنا تاثر بیان کیا تو خود ہم دہشت زدہ ہو کر رہ گئے۔ تب میرے ذہن میں علامہ محمد اقبالؒ کے یہ اشعار تازہ ہو گئے:

چناں خود را نگہ داری کہ بااین بے نیازی ہا
شہادت بر وجود خود ز خون دوستاں خواہی
مقامِ بندگی دیگر' مقامِ عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی زخاکی بیش ازاں خواہی

[زبورِ عجم]

[اگرچہ تو بے نیاز ہے' لیکن چاہتا ہے کہ تیری توحید کی گواہی تیرے عاشق اپنے خون سے دیں۔ مقامِ بندگی اور ہے' مقامِ عاشقی اور ہے' بندگی کے اعتبار سے فرشتے سب سے آگے ہیں۔ اے اللہ! تو اپنی نوری مخلوق سے تو صرف سجدہ چاہتا ہے' لیکن خاکی انسان سے تو اس سے کہیں بڑھ کر چاہتا ہے۔]

میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ اسٹیج تیار ہو چکا ہے، جس میں مسیح الدجال کو نکلنا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کو اترنا ہے۔ جیسا کہ ایک خطبے میں نبی کریمؐ نے فرمایا: جب سے اللہ تعالیٰ نے دنیا بنائی اور اولادِ آدم کو پیدا کیا ہے' تب سے زمین پر کوئی فتنہ' فتنۂ دجال سے بڑا نہیں--- وہ شام اور عراق کے درمیانی علاقے سے نکلے گا اور بہت تیز چلتا ہوا چاروں طرف فساد پھیلا دے گا۔ دائیں بائیں سب جگہ پر آئے گا۔ پس اے بندگانِ خدا' ثابت قدم رہنا۔ سنو' اس کے فتنوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ جنت اور دوزخ ہوگی۔ دراصل اس کی دوزخ' جنت ہے اور جنت'

دوزخ ہے۔ اگر تم میں سے کسی کو ایسا موقع پیش آ جائے کہ وہ اسے اپنی جہنم میں ڈالنا چاہے تو وہ جناب باری تعالیٰ میں فریاد رسی چاہ کر سورۂ کہف کے شروع کی دس آیات پڑھ لے تو وہ آگ اس پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جائے گی جیسا کہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہو گئی تھی'۔
(مشکوٰۃ' ج ۲' ص: ۴۷۳)

میں نے جب ابا جان کے حوالے سے اپنی یادداشتوں کو تازہ کیا تو اُس خواب کی معنویت اور زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی۔ آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں' اس میں یہ خواب خود اپنی تعبیر ہے۔ کابل وقندھار کی بربادی' بغداد و بصرہ پر مسلط کی جانے والی تباہی' فلسطین و کشمیر میں خون کی ہولی اور گوانٹانا موبے اور ابوغریب کی جیلوں میں ہونے والے مظالم' چیچنیا اور بوسنیا میں مسلمانوں پر تشدد کی بدترین مثالیں دیکھ کر کسی غلط فہمی کی بھلا کہاں گنجایش باقی رہ جاتی ہے--- ایک جانب مکی و مدنی آقاؐ کے پیروکاروں کی یہ داستانِ الم اور دوسری جانب اُمید کی بشارت اور عمل کی ترغیب' ہمارے لیے سبق آموز ہے۔

غیر عرب علاقوں سے ملنے والی' اسلام کی سربلندی کے لیے جس قوت کا تذکرہ ابا جان نے ان پائلٹوں سے کیا تھا' ان کی تائید مصر کے معروف اخبار الاھرام میں چھپنے والے اس بیان سے ہوتی ہے' جو مصر کے سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل المشیر ابوغزالہ کا ہے۔ وہ کہتے ہیں: 'پاکستانی مسلح افواج' عربوں کے تحفظ کی ضامن ہیں' جن کی پہنچ اسرائیل تک ہے۔ اس لیے اقتصادی بحران سے نکالنے کے لیے عربوں کو پاکستان کی مدد کرنی چاہیے' پاکستان کی کامیابی پورے عالم عرب کی کامیابی ہے'۔

پھر عالم عرب کے معروف اخبار الا تحاد میں اپنے ایک اور تجزیاتی مقالے میں جنرل المشیر ابوغزالہ لکھتے ہیں: 'پاکستان ایک بڑی عسکری قوت ہے' جس کے پاس ایٹمی وارہیڈ ہیں' لہٰذا پاکستان کو پہنچنے والے کسی بھی نقصان کا براہ راست اثر عالم عرب کی صورت حال پر پڑ سکتا ہے'۔ جنرل ابوغزالہ کے ان بیانات سے مندرجہ بالا خواب کی تعبیر مزید نکھر کر سامنے آ جاتی ہے۔

ابا جان کی آخری بیماری

بار بار جیل جانے کی وجہ سے اباجان کی صحت بہت زیادہ متاثر ہو گئی تھی۔ لہٰذا اماں جان نے اپنے درس قرآن کی مصروفیات کافی کم کر دی تھیں۔ وہ ماڈل ٹاؤن لیڈیز کلب میں ۲۵ سال سے درس دے رہی تھیں، جہاں انھوں نے شاگردوں کی ایک ٹیم تیار کی تھی۔ آخرکار درس کا معاملہ اپنی شاگردوں کے حوالے کر دیا اور سارا وقت اباجان کی خدمت میں گزارنے لگیں۔ ایک روز وہیں درس کی مجلس میں کسی نے اماں جان سے پوچھا تھا: 'آپ نے کتنے مضامین میں ایم اے کیا ہے؟' تو کہنے لگیں: 'بیٹی، ایم اے، بی اے تو آپ لوگ ہیں۔ میں نے تو دہلی کے کوئین میری اسکول سے مڈل تک پڑھا ہے'۔ انھوں نے پوچھا: 'پھر آپ کے پاس اتنا علم کیسے ہے؟' اس سوال کا اماں جان نے یہ تاریخی جواب دیا: 'میں نے زندگی ایک ایسے عالمِ دین کے ساتھ گزاری ہے، جن کی ایک گھنٹے کی بات چیت سن کر آدمی کو وہ علم حاصل ہو جاتا ہے، جو لوگوں کو رات رات بھر کتابیں پڑھ کر بھی نہیں ملتا!'

ایک مرتبہ کچھ خواتین اماں جان کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور قوم میں قحط الرجال کی شکایت کی۔ اماں جان خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہیں۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکیں جو وہ کہنا چاہتی تھیں، تو پھر اماں جان نے کہا: 'اس قحط الرجال کی ذمے دار یہ قوم خود ہے، ورنہ لیڈر اور رہنما تو اس قوم کو ایسے ملے تھے، جو دوسری قوموں کو شاذونادر ہی ملتے ہیں--- اس قوم کو علامہ اقبالؒ جیسے رہنما ملے، جن کو پوری دنیا کے مسلمان اپنا پیشوا و مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ دوسرے رہنما اس قوم کو مولانا مودودیؒ ملے، جنھوں نے افکار کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا، عصرِ حاضر کے جتنے بنیادی مسائل ہیں مثلاً فتنہ و فساد، بے پردگی، سود، مغربی جمہوریت، ضبط ولادت اور ان مسائل سے پیدا شدہ گھٹن۔ انھوں نے ان مہلک امراض کی بالکل صحیح تشخیص کر کے ان کا علاج قرآن و حدیث اور سنت نبویؐ سے پیش کیا، جو ایک بے مثال کارنامہ ہے، لیکن اس قوم نے ان کی قدر نہ کی'۔

جب اباجان کی بیماری بڑھتی ہی گئی، تو انھوں نے ہم سے کہا: 'میں نے اپنے جسم پر بہت ستم ڈھائے ہیں۔ میں نے ان ہڈیوں پر ذرہ برابر ترس نہیں کھایا۔ اپنی آنکھوں کو نیند کی فطری ضرورت سے محروم رکھا۔ یہ سونا چاہتی تھیں، مگر میں لکھنا چاہتا تھا۔ دن کے وقت میری

اجتماعی زندگی کی مصروفیات مجھے لکھنے نہیں دیتی تھیں' اس لیے لے دے کر ایک رات ہی تو ہوتی تھی' جب میں جم کر لکھ سکتا تھا۔ رات کے کھانے اور عشا کی نماز کے بعد جو کام کرنے بیٹھتا تھا تو بسا اوقات فجر کی اذان ہو جاتی تھی۔ اگر ایسا نہ کرتا تو تفہیم القرآن کیسے مکمل ہوتی؟ بس' اب یہ آنکھیں مجھ سے انتقام لے رہی ہیں۔ اب میں سونا چاہتا ہوں' لیکن یہ بند ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ انھیں میں نے جاگنے کی ایسی عادت ڈال دی ہے کہ یہ سونے پر آمادہ ہی نہیں ہوتیں۔ چاہتا ہوں کہ میرا ذہن سوچنا بند کر دے تاکہ پرسکون ہو کر سو جاؤں' مگر دماغ کو سوچنے کی ایسی عادت ڈال چکا ہوں کہ یہ سوچنے سے باز ہی نہیں آتا! اب میری ہڈیاں مجھ سے انتقام لے رہی ہیں۔ پہلے میں نے انھیں آرام نہیں کرنے دیا تھا' اب یہ مجھے آرام نہیں کرنے دیتیں'۔

درد دُور کرنے والی ادویات کے استعمال نے ان کی صحت کو چاٹ لیا تھا۔ ایک دن باتوں باتوں میں اماں جان نے کہا: 'تبدیلی آب و ہوا سے شاید آپ کی طبیعت سنبھل جائے۔ اس لیے میں امّن [احمد فاروق] سے کہتی ہوں کہ آپ کو امریکا لے جائے تاکہ وہاں اطمینان سے علاج ہو'۔

ابا جان کی بیماری بڑھتی ہی گئی اور پھر بالآخر امریکا سے ہمارے بھائی ڈاکٹر احمد فاروق آئے اور اصرار کر کے ابا جان کو اماں جان سمیت ۲۶ مئی ۱۹۷۹ء کو امریکا لے گئے' تاکہ وہاں رہ کر زیادہ یکسوئی سے ان کا علاج کروایا جا سکے۔ امریکا میں مہینے بھر قیام کے بعد' علاج میں کچھ ردو بدل سے' طبیعت کافی بحال ہوئی اور انھوں نے سیرت سرور عالمؐ پر پوری تندہی سے کام شروع کر دیا۔

ساتھ ہی امریکا اور کینیڈا کے طول و عرض سے ملاقاتیوں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا۔ کافی تعداد میں ایسے لوگ آتے رہے جو ابا جان کا لٹریچر پڑھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ مشہور ناول The Roots کے مصنف ایلکس ہیلے (Alex Haley) بھی دور دراز کا سفر کر کے ملنے آئے اور The Roots آٹو گراف کے ساتھ پیش کیا۔ آنے والوں میں سیاہ فام بھی تھے اور سفید فام بھی۔ مسلم ممالک کے لوگ بھی کافی تعداد میں آئے' جنھوں نے یہی کہا کہ ہم تو صرف نام کے مسلمان تھے صحیح معنوں میں مسلمان تو آپ کا لٹریچر پڑھ کر ہوئے ہیں۔

ابا جان پر اُمید تھے کہ وہ سیرت سرور عالمؐ پر کام مکمل کر لیں گے' لیکن ۸ ستمبر

۱۹۷۹ء کو دل کا شدید دورہ پڑا۔ ابھی حالت سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ۲۱ ستمبر کو طبیعت پھر بگڑ گئی اور تشویش ناک صورت اختیار کر گئی۔ جگر اور گردے نے اچانک کام کرنا چھوڑ دیا۔ بالآخر وہ گھڑی آ ہی گئی جس کا آنا مقدر تھا ــــ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو بفیلو کے ہسپتال میں پاکستانی وقت کے مطابق شام پونے چھے بجے ابا جان نے اپنی جان' جاں آفرین کے سپرد کر دی' انا للّٰہ وانا الیہ راجعون!ــــ یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ○ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ○ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ○ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ○ (سورہ الفجر:۲۷-۳۰)' اے مطمئن جان لوٹ چل اپنے رب کی طرف تو اپنے رب سے راضی ہے اور تیرا رب تجھ سے راضی !---شامل ہو جا میرے صالح بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں'۔

یہ المناک خبر لے کر جب احمد فاروق ہسپتال سے آئے تو وہ غم سے نڈھال تھے۔ اماں جان نے کمال ہمت حوصلے کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساری رات کے جاگے ہوئے بھوکے پیاسے غم زدہ بیٹے کو چائے بنا کر پلائی' بسکٹ کھلائے اور اپنا غم پس پشت ڈال کر بیٹے کو دلاسا دیتے ہوئے کہا: 'شکر کرو' تم نے اپنے باپ کو دیکھا' ان کے سائے میں اتنی عمر گزاری' ورنہ وہ تو ۱۹۵۳ء ہی میں پھانسی چڑھنے کو تیار ہو گئے تھے۔ اگر اس وقت انھیں پھانسی دے دی گئی ہوتی تو تمھیں یہ یاد بھی نہ ہوتا کہ تمھارے ابا کی شکل کیسی تھی! ان کی آواز کیسی تھی'۔ اللہ اکبر' ایسا حوصلہ اور ایسا توکل علی اللّٰہ!

پھر' اماں جان نے سب کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا: 'اناللّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھو اور باتیں نہ کرو'۔ اس پر سب اکٹھے ہونے والے مرد اور خواتین حیران رہ گئے۔

میرے ماموں ڈاکٹر جلال شمسی' ٹورنٹو (کینیڈا) سے گاڑی چلا کر جب اماں جان کے پاس آئے تو شدتِ غم سے نڈھال تھے۔ مگر وہ اماں جان کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہنے لگے: "آپا جان' میں ٹورنٹو سے بفیلو (امریکا) تک روتا ہوا آیا ہوں۔ سوچتا تھا کہ آپ کا سامنا کیسے کروں گا؟ آپ سے کیا کہوں گا؟ لیکن آپ کو دیکھ کر تو میرے آنسو خشک ہو گئے۔ ایسی ہی حیرانی مجھے اس وقت ہوتی تھی' جب بھائی صاحب جیل جاتے تھے اور آپ چھوٹے چھوٹے بچوں کو لیے اطمینان سے بیٹھی رہتی تھیں۔ مجھے بتائیے کہ آپ کے پاس کون سی طاقت ہے؟ آپ یہ سب کیسے کر لیتی ہیں؟'

اماں جان نے کہا: 'اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان' توکل اور صبر وہ صفات ہیں، جن کی مدد سے آدمی مشکل ترین حالات سے بخیر و خوبی گزر سکتا ہے'۔

بھائی احمد فاروق نے جہاز چارٹر کر کے میت کو نیویارک پہنچایا۔ اسی اثنا میں امریکا میں مختلف ٹیلی وژن اباجان کے انتقال کی خبر نشر کر چکے تھے۔ اس لیے نیویارک ایئرپورٹ پر بڑی تعداد میں مختلف ممالک کے مسلمان جنازے میں شرکت کے لیے پہنچ گئے۔ احمد فاروق نے اماں جان کو پسنجر لاؤنج میں بٹھا دیا۔ اسی دوران وہاں بہت ساری پاکستانی' ہندستانی' ترک' عرب اور افریقی ممالک کی خواتین آ گئیں۔ ان کے ہمراہ آنے والے مرد باہر جنازہ پڑھنے کے لیے کھڑے تھے۔ کچھ پاکستانی خواتین نے جو اماں جان کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں' آپس میں باتیں کرنا شروع کر دیں: 'بفیلو سے body [یعنی میّت] آنی ہے' پتا نہیں باڈی پہنچی یا نہیں؟'

اماں جان نے کہا: 'میّت پہنچ گئی ہے!' ان عورتوں نے چونک کر اماں جان کی طرف دیکھا اور پوچھا: 'آپ کو کیسے پتا چلا کہ میّت پہنچ گئی ہے؟' انھوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: 'میں میّت کے ساتھ آئی ہوں'۔ عورتوں نے پوچھا: 'آپ کا ان سے کوئی تعلق ہے؟' جواب ملا: 'وہ میرے شوہر تھے'۔ وہ عورتیں چیخ پڑیں: 'ارے بیگم صاحبہ' آپ اتنے اطمینان اور سکون سے اتنا بڑا صدمہ دل میں لیے بیٹھی ہوئی ہیں۔ ہم اور ہمارے مرد سارا راستا روتے آئے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر تو اللہ یاد آ گیا!' اور پھر آہستہ آہستہ ان ساری ترک' انڈونیشی' عرب اور افریقی ممالک کی خواتین کو بھی پتا چل گیا کہ یہ خاتون' مولانا مودودی صاحب کی بیگم ہیں۔ ان سب نے اماں جان سے تعزیت کی۔ اندر پسنجرز لاؤنج میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اور باہر نماز جنازہ ادا کی جا رہی تھی۔ جگہ کی تنگی کے باعث نیویارک ایئرپورٹ پر چھے مرتبہ نماز جنازہ پڑھی گئی۔

جب جہاز لندن پہنچا تو وہاں عملاً پورے یورپ کے نمایندہ مسلمان جمع تھے' وہاں بھی اسی طرح کئی بار نماز جنازہ ادا کی گئی۔ غرض یہ کہ' اباجان دنیا سے اس شان سے رخصت ہوئے کہ تین براعظموں کو جگاتے ہوئے خود اپنی آخری آرام گاہ میں سو گئے۔ انھوں نے سب کچھ دوسروں کے لیے کیا۔ اپنی ذات اور اولاد کے مادی مستقبل کو خاطر میں نہ لائے۔

جس روز اماں جان' میت لے کر لاہور پہنچیں تو سب بچوں کو تسلی دی اور صبر کی تلقین

کرتے ہوئے کہا: 'ان کے لیے نہ روؤ' یہ خاکی جسم تو میلے کپڑوں کے مانند ہے' اس لیے کہ جسم روح کا لباس ہوتا ہے۔ کبھی یہ لباس نیا تھا' خوب صورت تھا' دیکھنے والوں کو بھلا لگتا تھا' لیکن پھر یہ لباس پرانا ہو گیا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا' جگہ جگہ پیوند لگانے پڑے' کہیں کہیں سے رفو کرنا پڑا اور پھر یہ پہننے کے قابل نہیں رہا اور روح نے اس کو اُتار کر رکھ دیا ہے۔ اس کی جگہ اللہ تعالیٰ کے نور کا لباس پہن لیا ہے۔ اب تمھارے ابا بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں' وہ بہت آرام سے ہیں اور اپنے حقیقی قدردان کے پاس چلے گئے ہیں۔ یہ تم جو دیکھ رہے ہو' یہ تو روح کے میلے کپڑے ہیں' جو تابوت میں بند ہو کر امریکا سے آئے ہیں۔ بھلا پھٹے ہوئے میلے کپڑوں پر بھی کوئی روتا ہے'۔

اس طرح انھوں نے اپنے انداز میں سب بچوں کو پرسا دیا اور صبر کی تلقین کی۔ ان الفاظ میں کیا جادو تھا' کہ انھیں سنتے ہی ہمارے آنسو خشک ہو گئے۔ وہ بڑے حوصلے کے ساتھ اس صدمے کو جھیل گئیں' لیکن پھر کچھ عرصے بعد افسردگی کا شکار ہو گئیں۔

میں ان دنوں جدہ میں لڑکیوں کے سعودی کالج کلیۃ البنات میں انگریزی زبان و ادب پڑھاتی تھی اور گرمیوں کی چھٹیوں میں لاہور آئی ہوئی تھی۔ اماں جان کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے' میں انھیں اصرار کر کے اپنے ساتھ جدہ لے گئی۔ پہلے تو وہ میرے ساتھ جانے پر راضی نہ ہوئیں اور کہا: 'بیٹی کے گھر بھلا کیسے جا سکتی ہوں'۔ میں نے بہت سمجھایا: 'آپ نے بیٹوں کی طرح پالا پوسا' بیٹوں کی طرح پڑھایا لکھایا' اب میں بیٹوں کی طرح کماتی ہوں' اس لیے آپ مجھے بیٹی نہیں بلکہ بیٹا سمجھیے! آپ کی افسردگی کا علاج دواؤں میں نہیں' مکے اور مدینے کی ہواؤں میں ہے'۔ یہ سن کر وہ چلنے پر راضی ہو گئیں۔ وہاں پہنچ کر میں نے ان کا اقامہ بنوالیا' تاکہ آنے جانے میں کوئی دشواری نہ رہے۔ پہلا ہی عمرہ کر کے آئیں تو تمام دوائیاں اٹھا کر الماری میں رکھ دیں کہ اب ان کی ضرورت نہیں۔

رمضان المبارک میں کئی عمرے کیے اور آخری عشرے میں ہم ان کو لے کر مدینہ منورہ چلے گئے۔ پاکستان ہاؤس میں قیام تھا اور وہ ان دنوں مسجد نبویؐ کے باب النسا کے بالمقابل تھا۔ اماں جان کا اصرار ہوتا تھا کہ سب سے اگلی صف میں جگہ لینی ہے۔ اس لیے ہم بھاگم بھاگ مسجد میں پہنچ کر اگلی صف میں جگہ لیتے تھے۔ اسی افراتفری میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ اماں جان سحری کے

وقت دمے کی یا بلڈ پریشر کی' یا اختلاج قلب کی دوائیں کھانا بھول گئیں' اور سحری کا وقت ختم ہو گیا۔

ایک دن میں نے عرض کیا: 'دوائیں' خاص طور پر دل کی دوائیں کھانا آپ کبھی نہ بھولیے' کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ مسجد نبویؐ کے سامنے پہنچ کر مسجد میں جانے سے محروم ہو جائیں' تو وہ میری طرف دیکھ کر بڑی حسرت سے کہنے لگیں ۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل' وہ دکان اپنی بڑھا گئے

میں وہاں سے تھوڑی دیر کے لیے ٹل گئی' واپس آئی تو دیکھا کہ میرا بیٹا اطہر [پ: ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء' لاہور] ' اماں جان سے پوچھ رہا تھا: 'امی تو کہتی ہیں کہ نانا ابا کتابیں لکھتے تھے اور آپ کہتی ہیں کہ وہ دل کی دوائی بیچتے تھے'۔ اماں جان اس بچے کو بڑی محبت سے سمجھا رہی تھیں: 'جو کچھ وہ لکھتے تھے' دل کی دوائی اسی میں ہوتی تھی'۔

پھر انتیسویں شب آئی۔ یہ ختم قرآن کی شب تھی۔ پورے مدینے میں اور خصوصاً مسجد نبویؐ میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ اسی لیے ہم لوگ بھی بہت پہلے سے عشا کی نماز کے لیے مسجد کی پہلی صف میں جا بیٹھے تھے۔ اقامت سے ذرا پہلے یکا یک' مسجد کی دو منتظم سعودی عورتیں اور ایک شرطہ آ موجود ہوئے اور بڑے کرخت لہجے میں زور زور سے حکم صادر کرنا شروع کیا: اِرجعوا وراء اِرجعوا وراء (پیچھے ہٹو' پیچھے ہٹو)۔ ہم جب پیچھے دیکھتے تھے تو پوری جگہ اس طرح بھری ہوئی تھی کہ تھال پھینکو تو سروں کے اوپر ہی اوپر سے پھسلتی جائے۔

آخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے بھی اسی طرح سخت لہجے میں پوچھا: لیش نرجع وراء؟ (ہم پیچھے کیوں ہٹیں؟) انھوں نے مجھے سعودی سمجھتے ہوئے جواب دیا: ضیوف خاص جاؤوا من بحرین (بحرین سے خاص مہمان آئے ہیں)۔ میں نے بھی اسی کرخت لہجے میں اتنے ہی زور سے ڈانٹ کر کہا: اِحنا کلنا ضیوف خاص وھٰذہ مسجد الرسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم ونحن ضیوف رّسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم! ھذا مسجدہ لیس ھو قصرھم (ہم سب خاص مہمان ہیں اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہیں۔ یہ مسجد نبویؐ ہے' کوئی ان کا محل نہیں ہے!)

میرے یہ کہتے ہی ساری سعودی خواتین جو نماز پڑھنے کے لیے بیٹھی تھیں یک زبان

ہو کر بول اٹھیں: 'صح صح کلام مضبوط! والھی کلام مضبوط'! (بالکل صحیح بالکل صحیح خدا کی قسم! بالکل درست بات ہے) اتنی دیر میں اقامت کی آواز بلند ہو گئی اور ہم اللہ اکبر کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ شرطہ اور شرطیاں [لیڈی پولیس ورکرز] وہاں سے چلی گئیں۔ لیکن جب ہم نے فرض کا سلام پھیرا اور سعودی خواتین نے میرا پاکستانی لباس دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا: والھی انت باکستانیه؟ من أین تعلمت عربی؟ (خدا کی قسم' کیا تم پاکستانی ہو؟ تم نے عربی کہاں سے سیکھی؟) تو میں نے اماں جان کی طرف اشارہ کیا اور کہا: من امّی وابی (اپنے والدین سے)۔ ان خواتین نے یہ سن کر اماں جان کے ہاتھ چوم لیے۔ عید کی نماز پڑھ کر ہم جدہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ واپس آ کر میں نے اماں جان سے پوچھا کہ آپ اپنی مدینے کی عبادت سے خوش تو ہیں نا؟ تو بس ٹھنڈا سانس بھر کر اتنا ہی کہا ع

روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شُد!

[ہم نے جی بھر کر پھول کو دیکھا بھی نہیں کہ بہار کا موسم ختم ہو گیا]

ان دنوں میری بیٹی رابعہ کو میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ میں اسے نصیحت کرتی رہتی تھی: 'بیٹی' تمھیں ہر حالت میں 'اے' گریڈ لینا ہے' تیاری بہت اچھی اور مکمل ہونی چاہیے' کیونکہ میٹرک کے رزلٹ پر ہی تمھارا پورا تعلیمی مستقبل منحصر ہے'۔ شاید اماں جان نے سن کر یہ بات پلے میں باندھ لی تھی۔ پھر جو نماز بھی پڑھتی تھیں' اس قدر لمبی ہوتی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا: 'آج کل آپ نمازوں میں بہت زیادہ مشقت کر رہی ہیں' کہیں اتنی لمبی لمبی نمازوں کے بعد طبیعت خراب نہ ہو جائے'۔ انھوں نے اس بات کا جو جواب دیا' وہ وہی بات تھی جو ایک ہفتہ پہلے میں نے رابعہ سے کہی تھی۔ کہنے لگیں: 'امتحان تو مجھے بھی دینا ہے اور امتحان بھی ایسا جس پر پوری اُخروی زندگی کا انحصار ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر پرچے میں میرا بھی 'اے' گریڈ آئے' یعنی ہر نماز اے گریڈ کی ہو' ہر روزہ اور ہر عمرہ 'اے' گریڈ کا ہو'۔

اور پھر جب کبھی ہم لمبی drive [سفر] پر جاتے تھے' مثلاً مدینہ منورہ یا طائف وغیرہ تو اماں جان گاڑی کے ڈیش بورڈ پر قرآن شریف رکھ لیا کرتی تھیں۔ پورے راستے میں کوئی بات کیے بغیر قرآن شریف کی کوئی سُورہ حفظ کرتی رہتی تھیں۔ غنچہ ہے تو گل ہو' گل ہے تو گلستاں ہو' کے

مصداق ہر وقت اپنے علم میں اضافہ کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھیں۔ اسی کوشش میں ایک بار سورۂ فتح حفظ کی، ایک مرتبہ سورۂ کہف کی ابتدائی دس اور آخری دس آیات حفظ کیں اور مسجد نبویؐ میں پہنچ کر تازہ حفظ کی ہوئی آیات نماز میں تلاوت کیں، اور پھر یہ حدیث نبویؐ سنائی: 'سب سے افضل تلاوتِ قرآن وہ ہوتی ہے جو نماز میں کھڑے ہوکر کی جائے'۔ جب سورۂ کہف کی ابتدائی اورآخری دس آیات یاد کر کے مسجد نبویؐ میں پہلی بار نماز میں پڑھیں تو کہنے لگیں: 'ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بہت بڑی دولت ہے، جو میں نے اپنے اندر سمیٹ لی ہے'۔ تھوڑی دیر بعد کہا: 'یقین کرو، ساری دولت، مادی طاقت، سارا حسن، سنگھار اور کمال تو آدمی کے اندر ہوتا ہے، باہر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ بہت سے لوگ جو یہ چیزیں باہر تلاش کرتے ہیں، وہ اندر سے بڑے مفلس، بہت کمزور اور کریہہ المنظر ہوتے ہیں، اسی لیے تو انھیں یہ چیزیں باہر تلاش کرنی پڑتی ہیں'۔

اس روز میری سمجھ میں آیا کہ کیوں اماں جان نے ابا جان سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا، کبھی میک اَپ نہیں کیا اور کبھی زیوروں کی خواہش نہیں کی۔ دراصل ان کو ایسی مصنوعی چیزوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان کا 'اندر' اتنا 'غنی' بھرپور اور حسین تھا کہ باہر انھیں کچھ چاہیے ہی نہیں تھا۔

اماں جان کی خواہش تھی کہ مکہ مکرمہ میں بھی اسی طرح ایک دو ہفتے رہ کر عبادت کی جائے۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر حافظ عبدالحق صاحب کی بیگم فرحانہ بہن سے بات کی۔ مکے میں ان کی رشتے داریاں اور تعلقات ہیں۔ انھوں نے فلیٹ کا انتظام کر دیا اور خود ان کے ساتھ دو ہفتے رہیں اور ان کی بے حد خدمت کی۔ اماں جان کی عادت تھی کہ وہ اکثر بار بات کا جواب شعر میں دیتی تھیں۔ جب مکہ معظّمہ سے واپس آئیں تو میں نے پوچھا کہ آپ کی وہاں عبادت کیسی رہی؟ جواب ملا:

نمی دانم چہ منزل بود، شب جائے کہ من بودم
بہر سو رقص بسمل بود، شب جائے کہ من بودم

خدا خود میر مجلس بود، اندر لامکاں خسرو
محمد شمع محفل بود، شب جائے کہ من بودم

[میں نہیں جانتا کہ وہ کیا منزل تھی، جہاں میں رات کو تھا۔ ہر طرف زخمیوں کے تڑپنے کا رقص جاری تھا، جہاں میں رات کو تھا۔ اے خسروؔ لامکاں میں خدا خود میر مجلس تھا اور وہاں محمدؐ شمع محفل تھے، جہاں میں رات کو تھا۔]

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ اس جواب پر یقیناً امیر خسرو [م: ۱۳۲۵ء] کی روح بھی وجد میں آ گئی ہوگی، کہ اماں جان کی طرف سے ایک اور شعر عنایت ہوا:

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

پھر مسکرا کر کہنے لگیں: 'اس شعر کا اصل مطلب تو حرم شریف میں جا کر کھلا، جب خانۂ کعبہ کی طرف دیکھتی تھی تو لوگ پروانہ وار طواف کر رہے ہوتے تھے اور انھیں دنیا و مافیہا کا کوئی ہوش نہیں ہوتا تھا۔ جب صفا و مروہ میں جا کر دیکھتی تھی تو سعی کرنے والے دیوانہ وار سعی کر رہے ہوتے تھے اور پھر جب حرم شریف سے واپس اپنے فلیٹ کی طرف آ رہی ہوتی تھی تو دکانوں میں خریداروں کا زبردست رش ہوتا تھا۔ وہاں بھی پروانے دیوانہ وار سونا، کپڑا، ٹرانسسٹر، گھڑیاں اور گھریلو استعمال کی چیزیں خریدنے کے لیے چکر لگا رہے ہوتے تھے۔ آخرت میں کامیابی کے طلب گار تو اپنی طلب میں دیوانے ہو کر پروانہ وار طواف و سعی کر رہے ہوتے تھے اور دنیا کے پرستاروں کو ان چیزوں کی طلب پاگل کیے دیتی تھی!'

اِدھر جب پاکستان میں اسما، خالد اور عائشہ [پ: ۴ مارچ ۱۹۵۶ء، لاہور] نے بہت اصرار کیا تو وہ واپس لاہور آ گئیں، لیکن اُن دنوں کو وہ کبھی نہ بھولیں جو انھوں نے مکے اور مدینے میں گزارے تھے۔

اماں جان

مجھے ابا جان کی کہی ہوئی ایک بات اکثر یاد آتی ہے، جو انھوں نے میرے ماموں خواجہ محمد شفیع مرحوم سے کہی تھی۔ اس وقت اماں جان بہت بیمار تھیں اور ماموں ان کی خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔ ابا جان نے کہا: 'جب لوگ نعرے لگاتے ہیں مولانا مودودی زندہ باد!

جماعت اسلامی زندہ باد! تو میں اپنے دل میں کہتا ہوں، محمودہ بیگم زندہ باد۔ جب کوئی فوج فتح مند ہوتی ہے اور اس کے سپہ سالار کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا جاتا ہے، تو اس وقت اس گم نام سپاہی کو کوئی یاد نہیں رکھتا، جس نے اپنی نقد جان ہار کر فتح کو ممکن بنایا ہوتا ہے۔ زندہ باد کے فلک شگاف نعروں میں کسی کی بے نفسی، خودداری، وفاداری، ہر کسی کی دل داری اور اپنی ذات کی نفی کس کو یاد رہتی ہے'۔

اماں جان اپنے استادوں کی بہت عزت و تکریم کرتی تھیں۔ دارالاسلام میں قیام کے زمانے میں مولانا امین احسن اصلاحیؒ [م: ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ء] روزانہ عصر سے مغرب تک درس قرآن دیا کرتے تھے۔ اماں جان بڑی باقاعدگی سے ان کا درس سنا کرتی تھیں، اور پھر درس سے واپس آ کر سبق یاد کیا کرتی تھیں۔ اسی طرح محترم مولانا عبدالغفار حسن صاحب سے حدیث پڑھی۔ ان دونوں اصحاب علم و فضل کی وہ بڑی تکریم کرتی تھیں اور ان کو اپنا استاد کہا کرتی تھیں۔ بعدازاں ان دونوں کے جماعت سے علیحدہ ہونے کا انھیں بہت صدمہ ہوا تھا۔ مولانا اصلاحیؒ صاحب کی چھوٹی صاحبزادی کی وہ 'رضاعی ماں' بھی تھیں۔ اس حوالے سے وہ کہا کرتی تھیں: 'میری تین نہیں، چار بیٹیاں ہیں'۔

ان کی یہ ادا مجھے کبھی نہیں بھولتی کہ انھوں نے اپنے عظیم شوہر کے عظیم نام کو کبھی 'جنس بازار' نہیں بنایا۔ ابا جان کے انتقال کے بعد صدر محمد ضیاء الحق صاحب [م: اگست ۱۹۸۸ء] نے اماں جان کو سینیٹ کی رکنیت قبول کرنے اور ڈپٹی چیئرپرسن بننے کی پیش کش کی۔ اس مقصد کے لیے پہلے عطیہ عنایت اللہ صاحبہ کو اور بعد میں آپا نثار فاطمہ مرحومہ کو بھیجا۔ اماں جان نے عطیہ عنایت اللہ صاحبہ کو تو پیار سے ٹال دیا، لیکن جب آپا نثار فاطمہ آئیں تو انھیں اپنا پسندیدہ مصرع سنایا ؏

'سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے'

اور پھر کہا: 'یہ قرآن و حدیث کا علم دنیا کمانے اور دنیاوی عہدے حاصل کرنے کے لیے نہیں ہے، یہ تو آخرت کمانے کا ذریعہ ہے۔ پھر کہنے لگیں: 'میں اپنے نیک نفس شوہر کے نام کو 'جنس بازار' نہیں بنا سکتی'۔ لوگ اپنی اور اپنی اولاد کی دنیا بنانے کے لیے جیتے ہیں، لیکن مولانا صاحب تو اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور خدمت کے لیے جیتے تھے۔ ان کے حسب حال تو بس نصراللہ خاں عزیز کا یہ شعر تھا:

مری زندگی کا مقصد، ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

پھر کہنے لگیں: 'اس دنیا میں مجھے اور میرے بچوں کو اس 'نام' کو کیش کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ اس نے ہمیں اپنے در سے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ اس 'نام' کی ضرورت ہمیں اس دن ہوگی، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے: وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُم وَمَآ اَلَتْنٰهُم مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّن شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ○ (سورہ طور:۲۱) [جو لوگ ایمان لائے ہیں اور ان کی اولاد بھی کسی درجۂ ایمان میں ان کے نقش قدم پر چلی ہے، ان کی اس اولاد کو بھی ہم (جنت میں) ان کے ساتھ ملا دیں گے اور ان کے عمل میں کوئی گھاٹا ان کو نہ دیں گے]۔

'پس میں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ میرا اور میرے بچوں کا انجام ان کے ساتھ کردے۔ ہم سب کو ان کے جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا وارث بنائے اور جنت الفردوس میں ہم سب کو اکٹھا کردے'۔ آمین! پس مولانا صاحب نے اپنے خدا کو راضی کر لیا اور خلق کی پروا تک نہ کی ــــ سارے جہاں سے لڑائی مول لی، لیکن خالق کو ناراض کر کے کبھی مخلوق کو راضی کرنے کی کوشش نہ کی، بقول محمد علی جوہر: ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اماں جان کے آخری ایّام

آخری عمر میں اماں جان ہر وقت ابا جان کو یاد کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ سخت گرمی اور حبس تھا کہ اچانک بجلی چلی گئی اور دیر تک نہ آئی۔ اماں جان چونکہ دمے کی دائمی مریضہ تھیں، اس لیے گرمی اور حبس سے ان کا برا حال ہوگیا۔ بجلی تھی کہ کسی طرح آنے کا نام نہ لیتی تھی، اسی حالت میں ذرا سی آنکھ لگ گئی۔ جب بیدار ہوئیں تو کہا: 'ابھی تمھارے ابا جان کی آواز آئی ہے: 'تم وہاں گرمی میں کیوں بیٹھی ہو، اوپر آ جاؤ نا۔ دیکھو یہاں کیسی اچھی ہوا چل رہی ہے!' پھر بڑی حسرت

سے کہنے لگیں: 'بھلا میں خود کیسے جاسکتی ہوں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آنا ہے'۔

جب طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو میری چھوٹی بہن اسما انھیں اپنے گھر لے گئی' جو ابا جان کے گھر کے بالکل ساتھ ہے۔ چند روز بعد میں انھیں ملنے گئی تو معلوم ہوا کہ آج اماں جان نہ بات کرتی ہیں اور نہ کچھ کھا رہی ہیں۔ میں نے ان کے پاس جا کر بس اتنا کہا ع

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب

اماں جان نے فوراً کہا:

رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

میں نے کہا: 'اماں جان کون کہتا ہے کہ آپ بیمار ہیں' آپ تو بالکل تندرست ہیں۔ لیجیے کھانا کھا لیجیے'۔ پھر وہ دلی کی باتیں کرتی رہیں اور بڑی خوشی سے کھانا کھا لیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ بہت بیمار تھیں اور کسی کو پہچان بھی نہیں رہی تھیں' بس یہی کہہ رہی تھیں: 'کوچہ پنڈت جانا ہے'۔ جب میں گئی تو اسما نے پوچھا: 'کوچہ پنڈت کیا ہے؟' میں نے بتایا کہ یہ دہلی کا مشہور محلّہ ہے جہاں ان کا سسرال' یعنی ابا جان کا گھر تھا'۔ اس کے بعد میں نے دہلی کے کئی محلوں کے نام لیے' چاندنی چوک کا ذکر کیا' بہت خوش ہوئیں لیکن کھانا کھانے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوئیں۔ میں نے عرض کیا ع

سوداگری نہیں' یہ عبادت خدا کی ہے

اماں جان تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی اور ذہن پر زور ڈالتی رہیں اور کہا:

او بے خبر' جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے
واعظ' کمال ترک میں ملتی ہے یاں مراد
دنیا بھی چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

اور پھر میرے ہاتھ سے سوپ پی لیا۔

آخری دنوں میں کسی کو پہچاننا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ایک دن مغرب کے وقت کہنے لگیں: 'روزہ کھولو! جلدی کرو مسجد نبویؐ میں تراویح پڑھنی ہے' آج ختم قرآن ہے' جلدی کرو۔ اگلی صف میں جگہ لینی ہے!' پھر کہنے لگیں: 'لو دیکھو' اتنی مشکل سے پہلی صف میں جگہ ملی ہے' اب کہتے ہیں پیچھے ہٹو' خاص مہمان آئے ہیں۔ ارے بھائی' ہم سب خاص مہمان ہیں' یہ رسولؐ اللہ کی مسجد ہے' کسی کا محل نہیں ہے'۔

آس پاس سب لوگ حیران تھے کہ اماں جان کیا کہہ رہی ہیں' لیکن میں سمجھ گئی کہ ان کی روح زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو کر اس وقت مسجد نبویؐ میں موجود ہے اور وہ اس رات کو رمضان المبارک کی ۲۹ ویں رات سمجھ رہی ہیں۔ اس دنیا میں یہ آخری بات تھی جو انھوں نے کی' اور اس کے بعد بالکل خاموش ہو گئیں۔ اناللہ و انا الیہ راجعون!

روایت ہے کہ مولانا رومؒ [م: ۱۲۷۳ء] کے مرض الموت میں ایک عالمِ دین ان کی عیادت کو آئے اور کہنے لگے: 'فکر نہ کیجیے' ان شاء اللہ شفا ہو گی'۔ مولانا رومؒ نے جواب دیا: اب شفا آپ کو مبارک ہو' بال برابر فرق رہ گیا ہے۔ پھر نور' نور میں شامل ہو جائے گا اور مٹی' مٹی میں چلی جائے گی ؎

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

ابا جان نے ۲۲ ستمبر ۱۹۷۹ء کو رحلت فرمائی اور اماں جان ۴ اپریل ۲۰۰۳ء کو بروز جمعہ رات ۸ بج کر ۲۰ منٹ پر اس جہان فانی سے رخصت ہوئیں اور اگلے دن بروز ہفتہ سوا گیارہ بجے مٹی میں جا ملیں۔

یہ سرگزشت میں اماں جان کے پسندیدہ شعر پر ختم کرتی ہوں ؎

سوئیں گے حشر تک کہ سبک دوش ہو چکے
بار امانت غم ہستی اتار کے

اشاریہ

○○○